# مبادیِ تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

قرآن و سنت اکیڈمی نئی دہلی ۲۵

# مبادئ تدبر قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

تخریج واشاریہ
اورنگ زیب اعظمی

**قرآن و سنت اکیڈمی**
N-1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

اشاعت جون ۲۰۰۲ء
ناشر قرآن وسنت اکیڈمی، نئی دہلی ۔ ۲۵
قیمت ۱۰۰ روپے

تقسیم کنندہ: **البلاغ پبلیکیشنز**

**10-Azami Apartment**
**N-1 Abul Fazl Enclave**
**Jamia Nagar, New Delhi-25**
**Ph: 011- 6914592**
**E.mail: talha@vsnl.com**



ملنے کے دیگر پتے:

۱۔ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۲۵
۲۔ نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، ممتاز بلڈنگ، گلی قاسم جان، دہلی ۔ ۶
۳۔ البدر بک سنٹر، مہاجنی ٹولہ، سرائے میر، اعظم گڑھ ۔ ۲۷۶۳۰۵

# ترتیب

# عرض ناشر

قرآن مجید کتاب ہدایت ہے۔ ابتدائے اسلام ہی سے اس کی افہام وتفہیم اور اس میں غور وفکر کا ایک طویل سلسلہ قائم ہے اور تا قیامت قائم رہے گا۔ ہر فرد اور ہر گروہ نے، ہر زمانے میں، اپنے ظرف اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس صحیفہ ربانی کو سمجھنے کی کوشش کی۔ لیکن بعض بنیادی اصولوں کو پیش نظر نہ رکھنے کے سبب بہت سے افراد اور گروہ تاویل آیات میں صراط مستقیم پر قائم نہ رہ سکے۔

علمائے امت بالخصوص علامہ ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ رحمہما اللہ نے اصول تفسیر پر قابل قدر کام کئے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ ''اصول تفسیر'' پر دیگر علوم کے مقابلے میں کم کام ہوا ہے اور جو کتابیں عربی اور دیگر زبانوں میں موجود ہیں، ان میں سے اکثر یا تو قدیم کتابوں کی تلخیص یا ان کی شرح پر مشتمل ہیں۔

ترجمان القرآن علامہ حمید الدین فراہیؒ کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے استاذ گرامی کی تحریروں کو سامنے رکھتے ہوئے ''مبادی تدبر قرآن کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جو اپنے فن پر مکمل تصنیف کہلانے کی تو مستحق نہیں ہے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب قرآن مجید پر غور وفکر کرنے کی راہ کھولتی ہے بلکہ اس شاہ راہ پر لا کر ڈال دیتی ہے جہاں سے فہم قرآن کی منزل قریب نظر آنے لگتی ہے یا بالفاظ دیگر یہ کتاب فہم قرآن کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا اصلاحی نے ۱۹۳۶ء میں ''تدبر قرآن'' اور ''تیسیر قرآن'' کے عنوان سے

ماہنامہ ''الاصلاح'' مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا جن کو بعد میں بعض دیگر مضامین کے ساتھ ''تدبر قرآن'' کے نام سے شائع کیا۔ مولانا کی تفسیر 'تدبر قرآن' کے شائع ہونے کے بعد دونوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے اسے ''مبادی تدبر قرآن'' کا نام دے دیا گیا۔ ہندوستان میں یہ کتاب پہلی بار قرآن وسنت اکیڈمی نئی دہلی شائع کر رہی ہے۔ توقع ہے کہ قرآن مجید کے مطالعہ سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ ایک مفید کتاب ثابت ہوگی۔

قرآن وسنت اکیڈمی کے قیام کا مقصد وحید یہ ہے کہ قرآن وسنت پر مبنی علماء و دانشوران ملت کی تحقیقات سامنے لائی جائیں۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

برادر عزیز اورنگ زیب اعظمی نے نامکمل حوالوں کو مکمل کر کے بعض مقامات پر مزید حوالے دیدیئے ہیں۔ نیز انھوں نے مختلف قسم کے اشاریے تیار کئے ہیں، انھیں بھی شامل کتاب کر دیا گیا ہے۔ ان اشاریوں سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ برادر موصوف اپنی اس قابل قدر کوشش کے لئے شکریہ کے مستحق ہیں۔

# مصنف کا تعارف

مولانا امین احسن اصلاحی ضلع اعظم گڑھ کے ایک معروف گاؤں بمہور میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا کے والد حافظ محمد مرتضی اپنے گاؤں کے ایک متوسط درجے کے زمین دار تھے۔ آپ کا بچپن گاؤں میں گذرا اور ابتدائی تعلیم بھی گھر پر ہی ہوئی۔ دس سال کی عمر میں مزید تعلیم کے لئے ۱۹۱۴ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے تیسرے درجہ میں داخل ہوئے اور آٹھ سال میں تعلیم مکمل کرلی۔

مدرسۃ الاصلاح میں مولانا کا شمار ایک ذہین وفطین طالب علم کی حیثیت سے ہوتا تھا، عربی بے تکلف بولتے تھے۔ مولانا اصلاحی کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں مولانا عبدالرحمن نگرامی کا بہت بڑا حصہ ہے جو اس وقت مدرسہ میں طلبہ کے اتالیق تھے۔ مولانا ان کی شخصیت سے بہت متاثر اور ان کی محنت وتوجہ کے معترف تھے۔

مولانا اصلاحی نے ۱۹۲۲ء میں مدرسۃ الاصلاح سے سند فراغت حاصل کی اور چند سال صحافت کے پیشہ سے منسلک رہے۔ بجنور سے شائع ہونے والے سہ روزہ اخبار ''مدینہ'' میں نائب مدیر کی حیثیت سے دو سال کام کیا۔ اس وقت مولانا کی عمر اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ اسی زمانے میں بچوں کے رسالہ ''غنچہ'' میں لکھتے رہے۔ مولانا نگرامی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے مشترکہ اخبار ہفتہ وار ''سچ'' میں بھی کام کیا۔

۱۹۲۵ء میں مولانا فراہی کی شاگردی میں آئے۔ مولانا فراہی سے قرآن مجید کا درس

لینا شروع کیا۔ اس دوران مدرسہ نے ادب عربی اور قرآن مجید کے درس مولانا اصلاحی سے متعلق کردیئے۔

مولانا اصلاحی نے صحافت کے پیشہ کو ترک کر کے مدرسہ پر آنے کے بعد از سر نو علمی زندگی کا آغاز کیا۔ مولانا فراہی سے قرآن مجید کا درس لینے کے لئے عربی زبان وادب، نحوو صرف اور بلاغت سے کماحقہ واقفیت بلکہ ان علوم میں درک حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ گو کہ مولانا نے مدرسۃ الاصلاح کی تعلیم کے دوران تمام علوم کا مطالعہ کیا تھا لیکن صحافت کی وادی میں جانے کے بعد ان کا تسلسل برقرار نہ رہ سکا۔ مولانا اصلاحی کے شوق مطالعہ کا یہ حال تھا کہ واقف کاروں کے بیان کے مطابق، وہ عشاء بعد مدرسہ کے کتب خانہ میں مطالعہ کے لئے بیٹھ جاتے تو رات کے دو تین بجے تک یہ سلسلہ جاری رکھتے۔ کبھی صبح بھی ہو جاتی تھی یہاں تک کہ مولانا کو خون کا پیشاب آنا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹروں کے اصرار پر آرام کرنا منظور کیا۔

مولانا فراہی کے فیض صحبت سے مولانا کے اندر قرآن مجید میں تدبر اور غور وفکر کرنے کا شوق وذوق پیدا ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں مولانا فراہی کی وفات کے بعد مولانا اصلاحی کا قرآن مجید سے شغف اسی طرح برقرار رہا بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہی پوری زندگی کے غور وفکر کا محور بن گیا۔ مولانا اصلاحی نے جہاں قرآن کو ایک ماہر فن سے پڑھا وہیں حدیث کو پڑھنے کے لیے بھی ایک ماہر فن کی جانب رجوع کیا۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری شارح ترمذی سے باقاعدہ نخبۃ الفکر اور ترمذی کا درس لیا۔

۱۹۳۵ء میں مولانا فراہی کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی ترتیب وتہذیب اور اشاعت کے لئے مدرسۃ الاصلاح میں دائرہ حمیدیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس کے زیر اہتمام ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ الاصلاح جاری کیا تا کہ مولانا فراہی کے افکار سے اردو خواں طبقہ کو بھی روشناس کیا جائے۔

جماعت اسلامی کے قیام کے بعد مولانا اس کے کاروان دعوت وعزیمت میں شامل ہوگئے۔ نائب امیر جماعت اور مرکزی مجلس شوری کے ممبر رہے۔ ۱۹۵۸ء میں بعض سیاسی اختلافات کی بنیاد پر جماعت سے علیحدہ ہوگئے۔

۱۹۵۶ء میں حکومت پاکستان نے اسلامی لاء کمیشن بنایا تو اس میں مولانا بطور ممبر شامل تھے۔ ۱۹۵۹ء میں ماہنامہ ''میثاق'' نکالنا شروع کیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا تفسیر تدبر قرآن کی تسوید کے لئے یکسو ہوگئے۔ ایک طرف میثاق میں تفسیر بالاقساط شائع ہونی شروع ہوگئی اور دوسری جانب وہ ملک وملت کی رہنمائی سے بھی غافل نہ ہوئے بلکہ رسالہ کو اس کام کے لئے بھرپور استعمال کیا۔ ماہنامہ الاصلاح کی طرح اس رسالہ نے بھی قرآن مجید ہی کو اپنا رہنما بنایا اور ملک وملت کے تمام امراض کا علاج اسی کے اندر تلاش کیا۔ اسی کے ساتھ ۱۹۶۱ء میں 'حلقۂ تدبر قرآن' کے تحت انھوں نے منتخب باصلاحیت وذی استعداد طلبہ کے لئے عربی زبان وادب، قرآن اور حدیث کی تعلیم کا اہتمام کیا۔ قرآنی خطوط پر ذہنی وفکری تعمیر اور افراد سازی کے اعتبار سے حلقۂ تدبر قرآن کا تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا چنانچہ ۱۹۸۰ء میں جب ''ادارہ تدبر قرآن وحدیث'' قائم ہوا تو 'حلقۂ تدبر قرآن' کے تربیت یافتہ افراد ہی مولانا کے دست وبازو بنے اور اس ادارہ کا ترجمان رسالہ 'تدبر' ۱۹۸۱ء سے بدستور ان کے قرآنی افکار کی اشاعت میں مصروف ہے۔

تفسیر سے فارغ ہونے کے بعد مولانا نے حدیث کی جانب توجہ کی اور اسے بحث وتحقیق کا موضوع بنایا لیکن اب قوی میں اعتدال نہ رہا تھا بلکہ پیرانہ سالی کے آزار اپنی جگہ بنا چکے تھے اور مولانا ہاتھ میں رعشہ کے سبب لکھنے سے معذور ہو چکے تھے۔ چنانچہ ابلاغ کے لیے انھوں نے لکچر کا انداز اختیار کیا۔ لکچر کے ذریعہ دو کتابیں 'مبادی تدبر حدیث' اور 'فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں' تیار ہوئیں، ان کے علاوہ موطا امام مالک اور صحیح بخاری کے منتخب ابواب کے درس دیتے رہے۔ موطا امام مالک کا درس شائع ہوگیا ہے اور

صحیح بخاری کا درس زیر ترتیب ہے۔

تفسیر تدبر قرآن کے علاوہ مولانا نے دین کے بہت ہی بنیادی موضوعات پر قلم اٹھایا اور حق ادا کر دیا، البتہ ان کی ہر تحریر کتاب اللہ کے محور پر گھومتی ہے۔

قرآن وسنت کے اس عظیم خادم نے ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی آغوش رحمت میں جگہ دے

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

## تصنیفات وتراجم

تراجم: مجموعہ تفاسیر فراہی، اقسام القرآن، ذبیح کون ہے

تصانیف: تدبر قرآن (۹ جلدیں) مبادی تدبر قرآن، حقیقتِ شرک، حقیقتِ توحید حقیقتِ نماز، حقیقت تقوی، اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل، قرآن مجید میں پردے کے احکام، دعوت دین اور اس کا طریق کار، تزکیہ نفس، اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام، اسلامی قانون کی تدوین، اسلامی ریاست، توضیحات، تنقیدات، فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں، مبادئ تدبر حدیث، شرح مؤطا امام مالک، شرح صحیح بخاری۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# دیباچہ

میں نے اول اول جب اپنے استاد، مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ، کے طرز فکر سے اردو خواں طبقہ کو روشناس کرانا چاہا تو مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر اعظم گڈھ، یوپی) سے ۱۹۳۶ء میں 'الاصلاح' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک جاری رہا۔ اس رسالے میں میں نے مولاناؒ کی تفسیر "نظام القرآن" کے مطبوعہ اجزاء کے ترجمے بھی شائع کئے اور مختلف مضامین میں مولاناؒ کے اصول تفسیر بھی بیان کئے۔ یہ مضامین اونچے علمی حلقوں میں بہت پسند کئے گئے اور انہی کی طلب پر بعد میں یہ "تدبر قرآن" کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی چھاپے گئے۔

میری نگاہ میں اس کتاب کی جو قدر و قیمت ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے غالباً اس امر کی یاد دہانی کافی ہوگی کہ میں اس کو اپنی تفسیر "تدبر قرآن" کا جیسا کہ میں نے تفسیر کے مقدمے میں اشارہ کیا ہے(۱)، مقدمہ بنانا چاہتا تھا لیکن بعض وجوہ سے، جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں ہے، مجھے یہ رائے تبدیل کر کے تفسیر کے لئے الگ مقدمہ لکھنا پڑا، تاہم اس کی اہمیت اب بھی میرے نزدیک اتنی ہے کہ میں ہر اس شخص کو جو ہمارے طریقہ پر قرآن پر غور کرنا چاہتا ہو، یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اس کتاب کو نہ صرف ایک بار بلکہ بار بار غور سے پڑھ لے، اسی سے اس کو تدبر قرآن کے ان اصولوں کی طرف رہنمائی ہوگی جو میں نے اپنے

---

(۱) تدبر قرآن ۱/۱۳

استاد سے سیکھے تھے اور جو میں نے اپنی تفسیر میں ملحوظ رکھے ہیں۔ میرے نزدیک یہی اصول ہیں جو ہمارے سلف صالحین میں سے ان لوگوں نے ملحوظ رکھے جن کو علم قرآن میں سے حصہ ملا اور آج بھی وہی لوگ قرآن میں سے کوئی حصہ پائیں گے جو ان اصولوں کو رہنما بنا کر قرآن میں غور کریں گے۔

اس مجموعے میں اصل مضامین تو وہی ہیں جو میرے قلم سے 'الاصلاح' کے دور میں نکلے ہیں لیکن محض تکمیل بحث کے لئے بعض مضامین بعد کے دور کے بھی میں نے اس میں شامل کر دئے ہیں، اس اضافہ سے بعض مقامات میں پڑھنے والوں کو کچھ تکرار سی محسوس ہوگی۔ میں چاہتا تو آسانی سے کتاب کے اس عیب کو دور کر دیتا لیکن محض اس خیال سے اس عیب کو گوارا کر لیا کہ یہ مباحث نہایت اہم ہیں، اس تکرار سے اس فائدے کی توقع ہے کہ یہ اچھی طرح قاری کے ذہن نشیں ہو جائیں گے اور یہ چیز مجھے اتنی عزیز ہے کہ میں تصنیفی حسن کو کسی حد تک قربان کر کے بھی اس کو حاصل کرنے کا آرزومند ہوں۔

تفسیر تدبر قرآن سے امتیاز کے خیال سے اس کتاب کا نام ''مبادی تدبر قرآن'' کر دیا گیا ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

لاہور ۱۹ر ستمبر ۱۹۶۹ء

باب ۱

# فہم قرآن کے لئے چند ابتدائی شرطیں

جس طرح نماز کے لئے طہارت اور 'وضو' شرط ہے، نماز کی برکت آدمی کو اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ وضو اور طہارت کے شرائط پورے کر کے نماز کا قصد کرے اسی طرح فہم قرآن کے لئے بھی کچھ ابتدائی شرطیں ہیں اور آدمی کو فہم قرآن کی نعمت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ ان شرائط کے اہتمام کے ساتھ قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ ہم یہاں مختصراً ان شرائط کو بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

## نیت کی پاکیزگی:

سب سے پہلی چیز نیت کی پاکیزگی ہے۔ نیت کی پاکیزگی سے مطلب یہ ہے کہ آدمی قرآن مجید کو صرف طلب ہدایت کے لئے پڑھے کسی اور غرض کو سامنے رکھ کر نہ پڑھے۔ اگر طلب ہدایت کے سوا آدمی کے سامنے کوئی اور غرض ہوگی تو نہ صرف یہ کہ وہ قرآن کے فیض سے محروم رہے گا بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ قرآن سے جتنا دور وہ اب تک رہا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ دور ہٹ جائے۔ اگر آدمی قرآن کو اس لئے پڑھے کہ لوگ اسے مفسر قرآن سمجھنے لگیں اور وہ کوئی تفسیر لکھ کر جلد اس سے شہرت اور نفع دنیاوی حاصل کر سکے تو ممکن ہے اس کی یہ غرض حاصل ہو جائے لیکن قرآن مجید کے علم سے وہ محروم رہے گا۔ اسی طرح اگر آدمی کے کچھ اپنے نظریات ہوں اور وہ قرآن کی طرف اس لئے رجوع کرے کہ ان

نظریات کے لئے قرآن سے کچھ دلائل ہاتھ آجائیں تو ممکن ہے وہ قرآن سے کچھ الٹی سیدھی دلیلیں ، اپنے خیال کے مطابق ، اپنے نظریات کی تائید میں نکالنے میں کامیاب ہوجائے لیکن ساتھ ہی اس حرکت کے سبب سے وہ اپنے اوپر فہم قرآن کا دروازہ بالکل بند کرلے گا۔

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا صحیفہ بنا کر اتارا ہے اور ہر آدمی کے اندر طلب ہدایت کا داعیہ ودیعت فرمایا ہے۔ اگر اسی داعیہ کے تحت آدمی قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اس سے بقدر کوشش اور بقدر توفیق الٰہی فیض پاتا ہے۔ اگر اس داعیہ کے علاوہ کسی اور داعیہ کے تحت وہ قرآن کو استعمال کرنا چاہتا ہے تو "لکل امرء ما نوی" (۱) کے اصول کے مطابق وہ وہی چیز پاتا ہے جس کی اس کو تلاش ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی اس خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ

يُضِلُّ بِهِ كَثِيراً وَيَهْدِىْ بِهِ كَثِيراً (۲) — اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے"

اور یہ اصول بیان فرمانے کے بعد یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ

وَمَا يُضِلُّ بِهِ اِلَّا الفَاسِقِينَ (۳) — اور وہ نہیں گمراہ کرتا مگر انہیں لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں

یعنی جو لوگ فطرت کی سیدھی راہ سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہدایت سے

---

(۱) پوری روایت یوں ہے " إنما الأعمال بالنيات وإنما لكل إمرى ما نوى فمن كانت هجرته لدنيا يصيبها أو إمرأة ينكحها فهجرته إلى ما هاجر اليه"

البخاری ۱/ ۷ ص ۱۵، صحیح مسلم: ۱۹۰۷ اور ۲۲۰۱، صحیح الترمذی: ۱۶۴۷ اور صحیح النسائی ۱/ ۵۹، ۶۰

(۲) البقرة: ۲۶

(۳) البقرة : ۲۶

بھی ضلالت ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو وہی چیز دیتا ہے جس کے وہ بھوکے ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص کعبہ جا کر بھی بتوں ہی کو یاد کرنا چاہتا ہے تو وہ ہرگز اس بات کا سزاوار نہیں ہے کہ اس پر توحید کے رموز کھولے جائیں۔ اگر کوئی شخص پھولوں کے اندر سے بھی کانٹے ہی جمع کرنے کا شوق رکھتا ہے تو وہ ہرگز اس کا مستحق نہیں ہے کہ اس کو پھولوں کی خوشبو نصیب ہو۔ اگر ایک شخص اپنے فساد طبیعت کے سبب سے علاج کو بھی بیماری بنالیتا ہے تو وہ اسی بات کے لائق ہے کہ شفا حاصل ہونے کے بجائے اس کی بیماری ہی میں اضافہ ہو۔

اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے سورہ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت میں اشارہ فرمایا ہے:

أُولٰـئِكَ الَّـذِيـنَ اشْتَـرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ. (۱)

یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت پر گمرہی کو ترجیح دی تو انکی تجارت ان کے لئے نفع بخش نہ ہوئی اور یہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔

## قرآن کو ایک برتر کلام مانا جائے:

دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک اعلیٰ اور برتر کلام مان کر اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر دل میں قرآن مجید کی عظمت واہمیت نہ ہو تو آدمی اس کے سمجھنے اور اس کے حقائق و معارف کے دریافت کرنے پر وہ محنت صرف نہیں کرسکتا جو اس کے خزائن حکمت سے مستفید ہونے کیلئے ضروری ہے۔ بظاہر یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوگی کہ ایک کتاب کے متعلق اس کے جاننے سے پہلے ہی حسن ظن قائم کرلیا جائے کہ وہ بڑی پر حکمت اور اعلیٰ کتاب ہے لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کے متعلق اس قسم کا حسن ظن پیدا ہونا ایک نہایت معقول بات ہے۔ قرآن اپنے پیچھے ایک عظیم الشان تاریخ رکھتا ہے۔ اس کے کارنامے نہایت شاندار ہیں، ذہنوں اور دماغوں کی تبدیلی میں اس

---

(۱) البقرة-۱٦

کتاب نے جو معجزہ دکھایا ہے آج تک کسی کتاب نے بھی یہ معجزہ نہیں دکھایا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ دنیا کی آبادی کا ایک عظیم حصہ اس کو نہ صرف کتاب مانتا ہے، بلکہ اس کو خدائی اور آسمانی کتاب مانتا ہے، اس کو لوح محفوظ سے اترا ہوا کلام مانتا ہے، ایک ایسا معجز کلام مانتا ہے، جس کی نظیر نہ انسان پیش کر سکتے نہ جنات پیش کر سکتے ہیں۔ ایک ایسا کلام جس کے ماضی اور جس کے حاضر کے متعلق یہ شہادتیں اور لوگوں کے یہ احساسات موجود ہوں، بہر حال ایک اہمیت رکھنے والا کلام ہے اور آدمی اس کو سمجھنے کا حق اسی وقت ادا کر سکتا ہے جب اس کی یہ عظمت و اہمیت اس کے پیش نظر ہو۔ اگر یہ اہمیت اس کے سامنے نہ ہو تو ممکن نہیں ہے کہ آدمی کا ذہن اس کو اس اہتمام کا مستحق سمجھے جو اہتمام اس کیلئے فی الواقع مطلوب ہے۔ اگر کسی رقبہ زمین کے متعلق یہ علم ہو کہ وہاں سے سونا نکلتا ہے اور کسی زمانہ میں وہاں سے کافی سونا برآمد ہو چکا ہے تو توقع یہی کی جاتی ہے کہ اگر کھدائی کی جائے تو یہاں سے سونا نکلے گا اور پھر اس کی اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کا سروسامان کیا جاتا ہے اور اس پر محنت صرف کی جاتی ہے۔ لیکن ایک معدن کو اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ایک گھورا ہے یا یہ کہ اگر یہاں محنت کی جائے تو یہاں سے زیادہ سے زیادہ کوئلہ یا چونا فراہم ہو سکے گا تو اس پر یا تو کوئی سرے سے اپنا وقت ہی ضائع کرنا پسند نہیں کرے گا یا کرے گا تو صرف اس حد تک جس حد تک اس سے اس کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہوگی۔

یہ تنبیہ ہم نے اس لئے ضروری سمجھی ہے کہ قرآن مجید کے متعلق ایسی غلط فہمیاں لوگوں کے اندر موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں ہے کہ اس کو اس اعتناء و اہتمام کا مستحق سمجھا جائے جو اس سے حقیقی استفادہ کیلئے ضروری ہے۔ یہ غلط فہمیاں قرآن مجید کے ماننے والوں اور اس کے منکروں دونوں کے اندر موجود ہیں۔ جو اس کے منکر ہیں وہ اس بات کا تو ایک حد تک اعتراف کرتے ہیں کہ ایک خاص دور میں اس کتاب کے ذریعہ سے کچھ اصلاحات واقع ہوئیں، لیکن انکے خیال میں وہ زمانہ اب گذر چکا۔ عرب کے بدوؤں کیلئے، جن کے مسائل

سیدھے سادھے تھے ،ان لوگوں کے خیال میں یہ کتاب مفید ہوسکتی تھی ،لیکن موجودہ زمانے کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کیلئے وہ اس کتاب کو کافی نہیں سمجھتے ۔

جو اس کو ماننے والے ہیں ان میں بہت سے لوگ اس کو محض حرام وحلال کے بتانے کا ایک فقہی ضابطہ سمجھتے ہیں اور فقہ کے احکام علیحدہ مرتب ہو جانے کے بعد ان کی نگاہوں میں اگر اس کی کوئی اہمیت باقی رہ گئی ہے تو صرف تبرک کے نقطہ نظر سے رہ گئی ہے ۔ بہت سے لوگ اس کو اچھی اچھی نصیحتوں کا ایک مجموعہ سمجھتے ہیں ۔ بہت سے لوگ نزع کی سختیوں کے دور کرنے اور ایصال ثواب کی کتاب سمجھتے ہیں ۔ بہت سے لوگ اس کو دفع آفات و بلیات کا تعویذ سمجھتے ہیں ۔ اور جس طرح عیسائی دل کے جانب والے جیب میں انجیل رکھے پھرتے ہیں اسی طرح اس خیال کے مسلمان جیب میں قرآن حکیم کو رکھتے ہیں ۔ اس طرح کی غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے مسلمان ناممکن ہے کہ قرآن حکیم سے وہ فائدہ اٹھا سکیں جس کے لئے فی الحقیقت وہ نازل ہوا ہے ۔ ان لوگوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کسی شخص کو ایک توپ دی جائے کہ وہ اس کے ذریعہ سے دشمنوں کے قلعہ کو مسمار کرے لیکن وہ اس کو مچھر مارنے کی ایک مشین سمجھ بیٹھے اور اسی حقیر مقصد کے لئے اس کو استعمال کرنا شروع کردے ۔

## قرآن کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم:

قرآن حکیم سے حقیقی استفادہ کے لئے تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر قرآن مجید کے تقاضوں کے مطابق اپنے ظاہر و باطن کو بدلنے کا مضبوط ارادہ موجود ہو ۔ ایک شخص جب قرآن مجید کو گہری نگاہ سے پڑھتا ہے تو وہ ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کے تقاضے اور مطالبے اس کی اپنی خواہشوں اور چاہتوں سے بالکل مختلف ہیں ۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے تصورات ونظریات بھی قرآن سے بیشتر الگ ہیں اور اس کے معاملات وتعلقات بھی قرآن کے مقرر کردہ حدود سے ہٹے ہوئے ہیں ۔ وہ اپنے باطن کو بھی قرآن سے دور پاتا ہے اور اپنے ظاہر کو بھی اس سے بالکل منحرف محسوس کرتا ہے ۔ اس فرق و

اختلاف کو محسوس کر کے ایک صاحب عزم اور حق طلب آدمی تو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ خواہ کچھ ہو میں اپنے آپ کو قرآن کے تقاضوں کے مطابق بنا کے رہوں گا۔ وہ ہر قسم کی قربانیاں کر کے، ہر طرح کے مصائب جھیل کر، ہر قسم کی ناگواریاں برداشت کر کے اپنے آپ کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر اپنے آپ کو قرآن کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔لیکن جو شخص صاحب عزم نہیں ہوتا ہے وہ اس خلیج کو پاٹنے کی ہمت نہیں کر سکتا جو وہ اپنے اور قرآن کے درمیان حائل پاتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر میں اپنے عقائد و تصورات کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کروں تو مجھے ذہنی اور فکری حیثیت سے نیا جنم لینا پڑے گا۔ اسے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں اپنے اعمال و اخلاق کو قرآن کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کروں تو میرا اپنا ماحول میرے لئے بالکل اجنبی بن کے رہ جائے گا۔ اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے آپ کو ان مقاصد کی تکمیل میں سرگرم کروں جن کا مطالبہ مجھ سے قرآن کر رہا ہے تو میں جن منافع اور جن لذات سے متمتع ہو رہا ہوں ان سے متمتع ہونا تو الگ رہا عجب نہیں کہ جیل اور پھانسی کی سزاؤں سے دوچار ہونا پڑے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اگر میں اپنے وسائل معاش کو قرآن کے ضابطہ حلال وحرام کی کسوٹی پر پرکھوں تو آج جو عیش مجھے حاصل ہے اس سے محروم ہو کر شاید اپنی نان شبینہ کیلئے فکر مند ہونا پڑے۔ ان خطروں کے مقابل میں ڈٹ جانا اور ان سے مقابلہ کرنے کے لئے کمر ہمت باندھ لینا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ صرف مردان کار ہی ان گھاٹیوں کو پار کر سکتے ہیں۔ معمولی ہمت وارادہ کے لوگ یہیں سے اپنا رخ بدل لیتے ہیں۔ بعض جو اپنی کمزوریوں پر زیادہ پردہ ڈالنے کے خواہشمند نہیں ہوتے وہ تو یہ کہتے ہوئے اپنے نفس کی خواہشوں کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں کہ قرآن مجید کا راستہ ہے تو بالکل صحیح لیکن ہمارے لئے اس پر چلنا نہایت مشکل ہے، اس لئے ہم اسی راہ پر چلیں گے جس راہ پر ہم کو ہمارا نفس لے جا رہا ہے لیکن جو لوگ اپنی کمزوریوں کو عزیمت اور اپنے نفاق کو ایمان کے روپ میں پیش کرنے کا

شوق رکھتے ہیں وہ اپنا یہ شوق مختلف تدبیروں سے پورا کرتے ہیں۔ بعض اضطرار اور مجبوری کے بہانوں سے اپنے لئے ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال بناتے ہیں۔ بعض جھوٹی اور باطل تاویلات کے ذریعہ سے باطل پر حق کا ملمع چڑھاتے ہیں۔ بعض وقت کے تقاضوں اور مصالح کی آڑ تلاش کرتے ہیں۔ بعض کتاب الٰہی میں اس قسم کی تحریفیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس قسم کی تحریفیں یہود نے اللہ کی کتاب میں کی تھیں۔ بعض کفر و ایمان کے بیچ سے ایک راہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی قرآن کے جس حصہ کو اپنی خواہشوں کے مطابق پاتے ہیں۔ اس کی تو پیروی کرتے ہیں اور جس حصہ کو اپنی خواہشوں کے مطابق نہیں پاتے اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یہ ساری راہیں شیطان کی نکالی ہوئی ہیں اور ان میں سے جس راہ کو بھی آدمی اختیار کرے گا وہ اس کو سیدھے ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جائے گی۔ کامیابی اور فلاح کا راستہ صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو قرآن کے سانچہ میں ڈھالنے کی ہمت کرلے اور اس کے لئے ہر قربانی پر آمادہ ہو جائے۔ کچھ عرصہ تک اللہ تعالٰی کی طرف سے اس ارادہ کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر آدمی اس آزمائش میں اپنے آپ کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اس کیلئے سعادت کی راہیں کھلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو خدا اسکے لئے دوسرا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اگر ایک ماحول سے اس کو پھینکا جاتا ہے تو دوسرا ماحول اس کے خیر مقدم کیلئے آگے بڑھتا ہے۔ اگر ایک زمین اس کو پناہ دینے سے انکار کردیتی ہے تو دوسری سرزمین اس کیلئے اپنی آغوش کھول دیتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

وَ الَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (۱)

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے اور بے شک اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے۔

---

(۱) العنکبوت: ۶۹

## تدبر:

قرآن سے استفادہ کیلئے چوتھی شرط تدبر ہے۔اس شرط کا ذکر خود قرآن مجید نے بار بار کیا ہے

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۱) کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم جو قرآن کے مخاطب اول تھے وہ قرآن مجید کو برابر تدبر کے ساتھ پڑھتے تھے اور جو لوگ جتنا ہی تدبر کرتے تھے وہ اتنے ہی قرآن مجید کے فہم میں ممتاز تھے۔صحابہؓ نے قرآن مجید کے مطالعہ کے لئے حلقے بھی قائم کئے تھے جن میں اہل ذوق حضرات اکٹھے ہوکر قرآن کا اجتماعی مطالعہ کرتے تھے۔اس طرح کے قرآنی حلقوں سے نبی ﷺ کو خاص دلچسپی تھی (۲)۔روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعد میں خلفائے راشدین بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قسم کے حلقوں سے اور قرآن کے ماہرین سے برابر دلچسپی لیتے رہے۔(۳)

محض تبرک کے طور پر الفاظ کی تلاوت کر لینا اور قرآن کے معانی کی طرف دھیان نہ کرنا صحابہؓ کا طریقہ نہیں ہے۔یہ طریقہ تو اس وقت سے رائج ہوا ہے جب لوگوں نے قرآن مجید کو ایک صحیفہ ہدایت کے بجائے حصول برکت کی ایک کتاب سمجھنا شروع کر دیا۔جب زندگی کے مسائل سے قرآن کا تعلق صرف اس قدر رہ گیا کہ دم نزع اس کے

(۱) محمد:۲۴

(۲) حدیث کا مصدر اول نہ مل سکا، دیکھیں ثانوی مصدر: خطبات بھاولپور ص ۳۰۶

(۳) مجمع الزوائد: ۱/۳۳۱

ذریعہ سے جانکنی کی سختیوں کو آسان کیا جائے اور مرنے کے بعد اس کے ذریعہ سے میت کو ایصال ثواب کیا جائے۔ جب زندگی کے نشیب و فراز میں رہنما ہونے کے بجائے اس کا مصرف یہ رہ گیا کہ ہم جس ضلالت کا بھی ارتکاب کریں اس کے ذریعہ سے اس کا افتتاح کریں تا کہ یہ برکت دے کر اس ضلالت کو ہدایت بنا دیا کرے۔ جب لوگوں نے اس کو تعویذ کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تا کہ جب وہ اپنے شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لئے نکلیں تو قرآن ان کی حفاظت کرے کہ اس راہ میں کہیں ان کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس نے قرآن سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہو کہ اس کا حقیقی فائدہ صرف اس شکل میں حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کو پورے غور و تدبر کے ساتھ پڑھا جائے لیکن یہ بھی ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ یہی کتاب ہے جو ہمیشہ آنکھ بند کر کے پڑھی جاتی ہے۔ معمولی سے معمولی چیز بھی آدمی پڑھتا ہے تو اس کے لئے سب سے پہلے وہ اپنے دماغ کو حاضر کرنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ اس کو سمجھ سکے۔ لیکن قرآن کے ساتھ لوگوں کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ جب اس کو پڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے دماغ پر پٹی باندھ لیتے ہیں مبادا کہیں اس کے کسی لفظ کا مفہوم دماغ کو چھو جائے۔

## تفویض الی اللہ:

قرآن مجید سے صحیح فائدہ اٹھانے کیلئے پانچویں شرط یہ ہے کہ اس کی مشکلات میں آدمی بد دل اور مایوس ہونے یا قرآن مجید سے بدگمان یا اس پر معترض ہونے کے بجائے اپنی الجھن کو خدا کے سامنے پیش کرے اور اس سے مدد اور رہنمائی طلب کرے۔ قرآن میں آدمی کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے "قول ثقیل" (۱) کے نیچے دب گیا ہے کہ اس بار گراں کو اٹھانا اس کیلئے ناممکن ہے۔ اسی طرح وہ کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس کے

(۱) المزمل: ۵

سامنے کوئی ایسی مشکل آ گئی ہے۔جس کی کوئی ایسی تاویل ممکن ہی نہیں ہے۔جس پر دل مطمئن ہو سکے۔اس طرح کی عملی اور فکری مشکلوں اور الجھنوں سے نکلنے کا صحیح اور آزمودہ راستہ صرف یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اور قرآن مجید پر جما رہے۔اگر قرآن مجید یاد ہو تو شب کی نمازوں میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھے ،انشاء اللہ اس کی ساری الجھنیں دور ہو جائیں گی اور حکمت قرآن کے ایسے دروازے اس پر کھل جائیں گے کہ پھر اس کو قرآن حکیم کی ہر مشکل آسان معلوم ہونے لگے گی ۔مندرجہ ذیل دعا بھی اس طرح کے حالات میں پڑھتے رہنا نہایت نافع ہے۔

اللهم انيى عبدك ابن عبدك ابن امتك ناصيتي بيدك ما ض في حكمك عدل في قضائك اسئلك بكل اسم هو لك سميت به نفسك او انزلته في كتابك او علمته احدامن خلقك ان تجعل القران ربيع قلبي و نور صدري وجلاء حزني وذهاب همي وغمي.(۱)

اے اللہ! میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں ۔ میری پیشانی تیری مٹھی میں ہے ۔مجھ پر تیرا حکم جاری ہے ۔میرے بارہ میں تیرا فیصلہ حق ہے ۔ میں تجھ سے تیرے ہر اس نام کے واسطہ سے جو تیرا ہے،جس سے تو نے اپنے آپ کو پکارا ہے، یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں اتارا ہے ،یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں میں سے کسی کو سکھایا ہے یہ درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار ، میرے سینہ کا نور ،میرے غم کا مداوا اور میرے فکر و پریشانی کا علاج بنا دے ۔

(۱) الموطا، كتاب الجنائز: ۱۶ ، مسند أحمد: ۱، ۳۹۱، ۴۵۲

باب: ۲

# تدبر قرآن کے اصول و آداب

بعض طلبہ جو قرآن پر تدبر کر رہے ہیں اور اس کے پورے نظام کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مطالعہ قرآن میں کن آداب و امور کا لحاظ ضروری ہے۔ انکی رہنمائی کیلیے یہ سطریں لکھی جاتی ہیں۔ امید ہے کہ مطالعہ قرآن کے شائقین ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

## نیت کی درستی:

مطالعہ قرآن میں سب سے مقدم چیز، جیسا کہ پچھلے مضمون میں واضح ہو چکا ہے نیت اور ارادہ کی درستی ہے۔ نیت اور ارادہ کی درستی کا جو مفہوم بالعموم اس زمانہ میں سمجھا جاتا ہے ہم نے اس سے کسی قدر وسیع مفہوم پیش نظر رکھا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ یہاں ہم اس کی تشریح کر دیں۔

موجودہ زمانہ میں علوم کے تدبر و مطالعہ کا ایک خاص ڈھنگ ہے جس کی ایک مقبول عام شکل وہ ہے جس کو ہم ''ریسرچ'' (RESEARCH) کے نام سے جانتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ چیز کچھ اس زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، ہر زمانہ میں اہل علم و تحقیق کی راہ یہی رہی ہے، لیکن ہماری موجودہ پست حالی نے ہمتیں اس قدر پست کر دی ہیں کہ ہمارے اندر نہ تو اپنی قدیم اولوالعزمیوں کے لئے کوئی احترام باقی رہ گیا ہے نہ وقت کی راہوں میں ہمت

آزمائی کا کوئی حوصلہ۔ایسی حالت میں لوگوں کو یہ سمجھانا کہ قرآن مجید کا مطالعہ موجودہ زمانہ کی ادعائی ''ریسرچ'' کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہے ،ایک انوکھی اور عجیب سی بات ہوگی۔لیکن چونکہ حقیقت حال یہی ہے اس لئے ناگزیر ہے کہ یہ عجیب بات بیان کردی جائے۔آج اگرچہ ان باتوں کی قدر کرنے والے تھوڑے نکلیں گے۔لیکن اگر کچھ لوگ بھی ایسے نکل آئے جنہوں نے انکی قدر کی اور مطالعہ قرآن میں ان کا لحاظ رکھا تو انشاء اللہ اس سے بڑی برکتیں ہوں گی۔

جہاں تک قرآن مجید کے محل فکر و تدبر ہونے کا سوال ہے اس پر کچھ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔جن لوگوں کو دین کے فہم کا کوئی حصہ ملا ہے وہ اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے اسرار بغیر فکر و تدبر کے نہیں کھل سکتے ،لیکن قرآن مجید کے لئے صرف اسی قدر ضروری نہیں ہے کہ اس پر فکر و تدبر کیا جائے ، بلکہ اس فکر و تدبر کے کچھ خاص شرائط و آداب ہیں جن کا اہتمام اس راہ میں ضروری ہے اور اگر یہ اہتمام نہ کیا جائے تو یہ تدبر عموماً رائگاں جاتا ہے۔اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں باوجودیکہ تدبر قرآن کا ادعا روز بروز بڑھ رہا ہے ہمارے حالات میں کوئی اصلاح نہیں ہورہی ہے بلکہ اگر غور کیجئے تو نظر آئے گا کہ امید کی وہ ہلکی سی روشنی بھی جو کبھی کبھی ہماری عام مایوسیوں کے اندر نظر آجایا کرتی تھی آہستہ آہستہ غائب ہورہی ہے اور انتہائی بدقسمتی یہ ہے کہ آج جتنے فتنے اٹھ رہے ہیں وہ زیادہ تر قرآن ہی کے نام سے اٹھ رہے ہیں ،حالانکہ قرآن فتنوں کو مٹانے کے لئے آیا تھا،فتنوں کو ابھارنے اور ان کو غذا دینے کے لئے نہیں آیا تھا۔لیکن یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ ماضی میں بھی اور آج بھی جتنے فتنے اٹھے یا اٹھ رہے ہیں وہ سب قرآن ہی کی آڑ لے کر نمودار ہوئے ۔ خوارج اپنے گمان کے مطابق قرآن مجید ہی کے سہارے ابھرے،باطنیوں کے تمام استدلالات کی بنیاد ان کے خیال میں قرآن مجید ہی پر ہے۔بابیوں اور بہائیوں نے جو کچھ کہا اپنے زعم کے مطابق قرآن مجید ہی سے

کہا۔قادیانیوں کی نبوت کی اساس انکے دعوے کے مطابق قرآن مجید ہی پر ہے اور چکڑالوی تو قرآن مجید کے سوا کچھ بولتے ہی نہیں ۔اور یہ تو ہزاروں فرقوں اور گروہوں میں سے صرف چند کے نام لئے گئے ہیں ،تاریخ اسلام کے تمام فرقوں کے حالات اور انکے اساسی معتقدات اگر معلوم کیجئے تو قرآن مجید آپ کو ہرایک کے ہاتھ میں نظر آئے گا۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ قرآن مجید تو ہدایت اور رہنمائی کی روشنی ہے اس کو ضلالت اور گمراہی کی تاریکی سے کیا تعلق؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جو اس کو دیکھتا اور پڑھتا اس کو ٹھیک راہ مل جاتی ،سیدھا راستہ نظر آجاتا ،وہ ہدایت و ایمان سے معمور ہو جاتا ،ہر گوشہ میں وحدت و یک جہتی کی شاہ راہ اس پر کھل جاتی ،اختلاف وتفریق کے تمام کج پیچ نکل جاتے، اور اس کی تعلیم و دعوت کی ہم آہنگ ،غیر مبہم ،اور پرزور صداؤں سے اس کے دل و دماغ اس طرح بھر جاتے کہ اس کے علاوہ نہ وہ کچھ سوچ سکتا نہ کچھ سمجھ سکتا۔مگر ہو یہ رہا ہے کہ اس کو ایک تلوار کی طرح دوست اور دشمن دونوں استعمال کر رہے ہیں ۔مومن اسی کو لے کر حق و عدل کی حمایت کرتا ہے اور منافق اسی کے ذریعہ سچائی اور حقیقت کو مغلوب کر لینا چاہتا ہے۔ آخر قرآن ہر ایک پر کیوں نہیں کھل جاتا؟ اس کی صاف اور واضح تعلیمات ہر ایک کے دل کو کیوں نہیں پکڑ لیتی ہیں؟ اس کی اصلی تعریف تو یہی ہے کہ وہ ہر قسم کے کج پیچ سے پاک ہے، اپنی تعلیمات و توضیحات میں بالکل غیر مشتبہ اور غیر مبہم ہے اور اس کے ہر گوشہ میں کامل توافق ،کامل اتحاد ،کامل ہم آہنگی اور کامل وحدت نمایاں ہے پھر اس کے مختلف پڑھنے والے مختلف راہوں میں کیوں نکل جاتے ہیں؟ وہ سب کو کھینچ کر ایمان وعقیدہ کی ایک ہی شاہراہ پر کیوں نہیں کھڑا کر دیتا؟

ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کے مطالعہ کے کچھ خاص آداب وقواعد ہیں جن کا لحاظ واہتمام ضروری ہے ،ان کے بغیر قرآن کی راہ نہیں کھل سکتی ۔ان میں سب سے مقدم ،جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ،ارادہ اور نیت کی درستی ہے۔۔ یہ اللہ کی کتاب ہے اور خلق کی

ہدایت کے لئے نازل ہوئی ہے اس لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ انسان بالکل خالی الذہن ہو کر اس کو صرف طلب ہدایت کے لئے پڑھے اور اپنے قلب و دماغ کو پورے طور پر اس کے حوالے کردے، اپنے دل کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دے، تمام خیالات و معتقدات سے خالی ہو کر اپنے تئیں اس امر کے لئے آمادہ کرے کہ قرآن کے اندر اپنی خواہشات کے لئے سند جواز، اپنے معتقدات کے لئے حیلے اور اپنے نفس کے لئے جائے پناہ نہیں تلاش کرے گا، کج بحثیاں اور اعتراضات نہیں ڈھونڈھے گا، بلکہ تشفی اور طمانیت تلاش کرے گا۔ اس کی روشنی جس طرف رہنمائی کرے گی اسی طرف قدم بڑھائے گا۔ یہ کوشش نہیں کرے گا کہ قرآن مجید کو اپنی خواہشات نفس کے پیچھے لگائے۔ جس شخص کا مقصود طلب ہدایت نہ ہو بلکہ اعتراض اور کج بحثی ہو اور اس کی خواہشوں نے اسے دل میں جو وسوسے پیدا کردئے ہوں، قرآن مجید کو ان سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہو اس کے لئے قرآن مجید میں بالکل محرومی ہی محرومی ہے۔ قرآن مجید نے اپنی اس خصوصیت کی طرف خود اشارہ کردیا ہے

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيكَ الكِتٰبَ مِنهُ آيٰتٌ مُحكَمٰتٌ هُنَّ أُمُّ الكِتابِ وَ أُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ . فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنهُ ابتِغَاءَ الفِتنَةِ وَابتِغَاءَ تَأوِيلِهِ. وَمَا يَعْلَمُ تَأوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ وَ الرَّاسِخُونَ فِي العِلمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ . كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا . وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الأَلبَابِ. (۱)

وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری جس میں محکم آیات ہیں جو اصل کتاب کا درجہ رکھتی ہیں اور دوسری کچھ آیتیں اس میں ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔ تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں متشابہات کے درپے ہوتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تو جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے،

(۱) آل عمران : ۷

یہ سب ہمارے رب ہی کے پاس سے ہیں
اور یاددہانی تو اہل عقل ہی حاصل کرتے ہیں

## قرآن میں دو طرح کی آیات:

اجمالاً اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو طرح کی آیات ہیں۔ایک محکمات اور دوسری متشابہات محکمات اپنے مفہوم ومطلب میں بالکل واضح ہیں، ان میں کسی پہلو سے کسی طرح کا اشتباہ نہیں ہے۔انکا تعلق ہماری عملی اور اعتقادی زندگی کے اساسی مسائل سے ہے، اس لئے ہم انکے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں اور منطق واستدلال کی تمام کسوٹیوں پر جانچ کر ان کی نسبت اپنے قلب کو ہر طرح مطمئن کر سکتے ہیں۔

متشابہات کا حال ان سے کچھ مختلف ہے۔اصولی طور پر تو وہ عقل واستدلال کی نہایت محکم بنیادوں پر مبنی ہوا کرتی ہیں اس لئے ان پر اجمالاً ایمان لانے اور یقین کرنے میں عقل کو ذرا بھی الجھن نہیں ہوتی۔لیکن چونکہ انکا تعلق اس عالم محسوسات سے ماوراء احوال وامور سے ہوتا ہے اس وجہ سے انکی تفصیلات ہماری عقل ومنطق کے دائرے میں نہیں سماتیں۔

## قرآن پڑھنے والوں کی دو قسمیں:

پھر جس طرح قرآن مجید کی آیتوں کی دو قسمیں ہیں اسی طرح قرآن مجید کے پڑھنے والوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ لوگ ہیں جو اپنے ارادہ اور نیت کو درست کر کے اس کی طرف بڑھتے ہیں اور انکا مقصود طلب رشد وہدایت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔قرآن مجید فوراً ایسے لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اپنی تربیت میں لے لیتا ہے۔وہ اس کی محکمات میں اپنے روح وقلب کے لئے پوری آسودگی اور اپنی اعتقادی وعملی زندگی کیلئے پوری رہنمائی پاتے ہیں۔ایک مدت کی گم گشتگی اور ہرزہ گردی کے بعد انکو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا سکون قلب

اور طمانیت عقل کی بہشت میں پہنچ گئے ہیں۔ان کے دل کی تمام خلشیں دور ہوجاتی ہیں،شبہات وشکوک کے تمام کانٹے ایک ایک کرکے نکل جاتے ہیں۔متشابہات سے ان کے دل میں کوئی وحشت نہیں پیدا ہوتی،کیونکہ اصولی طور پر وہ بالکل عقل وحکمت پرمبنی ہوتی ہیں اور اجمالاً ان پر ایمان لانے میں عقل کو کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی،صرف یہ بات ہوتی ہے کہ انکی جزئیات کے متعلق کوئی تفصیلی تصور عقل کی گرفت میں نہیں آتا تو یہ ایسی چیز نہیں ہے جو سبب انکار واعراض ہو۔اگر ہمارے پاس ۹۹ روپے موجود ہیں تو بہتر ہوگا کہ اگر یہ پورے سو ہوجائیں،لیکن اگر ایسا نہ ہو تو کیا ہم اپنی جیب سے ۹۹ روپے پھینک دیں گے؟پس اس طرح کی آیات کے باب میں وہ خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا(۱) (ہم ان پر ایمان لائے۔یہ سب ہمارے رب ہی کے پاس سے ہیں)اور ان کا یہ کہنا بیوقوفی اور ناسمجھی کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے۔بلکہ عقل ودانش اور علم کی پختگی کی وجہ سے ہوتا،چنانچہ قرآن نے ان کو الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ(۲) (پختہ کاران علم)کے عظیم الشان لقب سے پکارا کیونکہ ان کا آیات متشابہات کے متعلق یہ اعتراف درحقیقت کمال عقل وحکمت،انتہائے فکروتدبر اور علم کی پختگی کی سب سے بڑی شہادت ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے معاملہ کو،جہاں تک اسکی اصل وبنیاد کا تعلق ہے،اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔اس کے متعلق ان کو کسی طرح کا تذبذب باقی نہیں رہ گیا ہے۔صرف اس کے بعض گوشوں کے متعلق ان کو شرح صدر کا انتظار ہے سو اس کے لئے وہ امیدوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جلد تشفی وطمانیت سے بہرہ مند فرمائے گا۔اور اگر کبھی یہ شکوک خلجان اور پریشانی کا سبب ہونے لگتے ہیں اور قلب کی طمانیت میں کچھ فتور نظر آتا ہے تو فوراً وہ دعا ان کی زبان پر جاری ہوجاتی ہے جو اسی آیت کے بعد ہی وارد ہے یعنی:

(۱) آل عمران : ۷

(۲) أیضاً : ۷

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً. اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. (۱)

اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت بخشنے کے بعد کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش تو نہایت بخشنے والا ہے

دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو اپنے ارادہ و نیت کی اصلاح کئے بغیر محض اپنے اغراض و خواہشات کی تائید ڈھونڈنے کے لئے قرآن پڑھتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی باگ قرآن کے ہاتھ میں دے دیں، چاہتے ہیں کہ قرآن کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کو جس طرف چاہیں پھیریں۔ ان کا مقصود طلب رشد و ہدایت سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے کسی قرار دادہ مسلک کی تائید کیلئے اس میں دلیلیں تلاش کریں، یا جن سے ان کو اختلاف ہے ان کو چپ کرانے کے لئے اس میں سے اعتراضات اور کج بحثیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگ جب قرآن مجید پڑھیں گے تو وہ محکمات پر نہیں ٹکیں گے کیونکہ وہ ان کے مطلب کی چیز نہیں بن سکتی ہیں۔ ان کو تسلی و طمانیت یا عمل و اطاعت کی راہ مطلوب نہیں ہے کہ اس کو پا کر مطمئن ہو جائیں۔ ان کو دراصل ٹھوکروں اور لغزشوں کی تلاش ہے اس لئے پورے قرآن میں صرف وہ بات ان کو پسند آئے گی جس سے اپنی خواہشوں کو تسلی دے سکیں یا اپنے مخالفوں کو چپ کرا سکیں۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی تلاش یہ ہوگی اس کو قرآن کے محکمات کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی، ایسے لوگ تو صرف متشابہات کی طرف بڑھیں گے اور جن باتوں کا اجمالاً مان لینا ان کے لئے کافی ہوتا وہ ان کی جزئیات و تفصیلات کے بخئے ادھیڑیں گے اور بالکل یہود کی طرح جن کو اس بات پر اعتراض تھا کہ دوزخ کی آگ میں درخت کیسے پائے جا سکتے ہیں اور اس اعتراض کی وجہ سے انہوں نے اپنے اوپر اللہ کی ہدایت کے دروازے بند کر لئے تھے، یہ لوگ بھی طرح طرح کے شبہات و شکوک پیدا کریں گے اور اس طرح اپنے آپ کو اللہ کی ہدایت سے محروم کر لیں گے۔

ان لوگوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ اپنے تئیں عقل و دانش کا پتلا سمجھتے ہیں لیکن

(۱) آل عمران : ۸

قرآن نے مندرجہ صدر آیت میں ان کو احمق اور بے عقل قرار دیا ہے اور فی الواقع ان لوگوں سے بڑھ کر بیوقوف کون ہوسکتا ہے جن کی سب سے بڑی آرزو یہ ہو کہ وہ پورے قرآن میں کوئی ایسی بات پالیں جوان کی خواہشوں کے سانچہ میں ڈھل سکے یا جس کو بنیاد قرار دے کر وہ ''قرآن'' پر اعتراضات کر سکیں؟ اس سے بڑھ کر بیوقوفی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک شخص حکمت کے نوسوننانوے اصولوں کو اس لئے ٹھکرادے کہ اس کے ہزارویں اصول کی تمام جزئیات ''پورے طور پر'' اس کی گرفت میں نہ آسکیں۔ یہاں ''پورے طور پر'' کے الفاظ پر ہم خاص طور پر زور دینا چاہتے ہیں اس لئے کہ متشابہات عقل اور ادراک سے بالکل خارج نہیں ہوا کرتی ہیں بلکہ عقل و ادراک کے دائرے کے اندر ہوتی ہیں، البتہ ان کی جزئیات کی تفصیل ہم نہیں سمجھ سکتے، کیونکہ ہمارے علم و مشاہدہ کی تمام معلومات ان کی مثالیں فراہم کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔

یہ اصلاً تو ان محرومین کا بیان ہے جو عہد نزول قرآن میں موجود تھے، لیکن اگر غور کیجئے تو اس آیت نے ہر دور کے راسخون فی العلم اور ارباب زیغ کی حقیقت واضح کردی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں قرآن کے پڑھنے والے انہی دو گروہوں میں تقسیم رہے ہیں ایک ''راسخون فی العلم اور اولوالالباب'' دوسرے ''طالبین فتنہ اور ارباب زیغ''۔ ایک گروہ کا اصلی مطمح نظر قرآن کا وہ حصہ رہا ہے جو محکمات سے متعلق ہے۔ کیونکہ اس کا مقصود طلب رشد و ہدایت تھا۔ اس گروہ نے قرآن سے فیض پایا اور صراط مستقیم کی ہدایت حاصل کی۔ دوسرا گروہ ارباب زیغ و تاویل کا تھا۔ اس نے قرآن کی طرف ہدایت کے لئے نہیں، بلکہ شرارت کے لئے قدم بڑھائے۔ ان کی نیتیں فاسد اور ان کے ارادے برے تھے۔ اس لئے قدرۃً یہ قرآن کے اس حصہ کی کھوج کرید میں مشغول ہوگیا جو متشابہات سے متعلق تھا اور جس میں عقل انسانی اگر سنبھل کر نہ چلے اور ہر قدم پر خدا کی توفیق شامل حال نہ ہو تو طرح طرح کی ٹھوکریں لگ سکتی ہیں۔

قرآن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عمل کی تعلیم اور قلب وروح کے تزکیہ کے لئے اتارا

ہے، دماغی عیاشیوں اور کج بحثیوں کے لئے نہیں اتارا ہے۔ اس لئے اس کا فیض صرف انہی لوگوں پر پہنچ سکتا ہے جو اس کے پاس پاک دل اور سننے والے کان لے کر حاضر ہوں، جنگجو دماغ اور الجھانے والی عقل لے کر نہ آئیں۔ سورہ ق میں فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَذِکْریٰ لِمَن کَانَ لَہٗ قَلْبٌ أو اَلْقیَ السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ. (۱) | بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی یاددہانی ہے جن کے پاس دل ہو یا وہ بات متوجہ ہوکر سننے کے لئے کان لگائیں۔ |

اور سورہ صافات میں قلب کے متعلق یہ تصریح فرمائی ہے کہ وہ سلیم ہو۔

| | |
|---|---|
| إذْ جَاءَ رَبَّہٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (۲) | جب کہ وہ حاضر ہوا اپنے رب کے حضور میں قلب سلیم کے ساتھ |

سورہ ق میں ہے:

| | |
|---|---|
| وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍ (۳) | اور حاضر ہوا متوجہ رہنے والے دل کے ساتھ |

ان دونوں لفظوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو خدا کا کلام سننے کیلئے آئے وہ قلب سلیم اور قلب منیب لے کر آئے، متکبر اور جبار کا قلب لے کر نہ آئے۔ کیونکہ ایسے دلوں پر اللہ کی مہر ہوتی ہے وہ خدا کی باتوں کے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں

| | |
|---|---|
| والَّذِینَ یُجَادِلُونَ فِی آیَاتِ اللّٰہِ بِغَیْرِ سُلْطَانٍ اَتٰھُم کَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللّٰہِ وَ عِنْدَ الَّذِینَ آمَنُوا کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلیٰ کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ. (۴) | جو اللہ کی آیات کے باب میں کٹ حجتی کرتے ہیں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، اللہ اور اہل ایمان کے نزدیک وہ نہایت مبغوض ہیں۔ اسی طرح اللہ مہر کر دیا کرتا ہے ہر متکبر و جبار کے دل پر۔ |

---

(۱) ق : ۳۷ (۲) الصافات : ۸۴

(۳) ق : ۳۳ (۴) المومن : ۳۵

قرآن کے تدبر کے پہلے ہی مرحلہ میں جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ اس کی طرف صرف وہی بڑھنا موجب خیر و برکت ہے جو ایمان اور عمل صالح کے حصول کے لئے ہو۔ اس ایک خواہش کے علاوہ اگر کسی شخص کے اندر کسی دوسری خواہش کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی پایا گیا تو پس قرآن کا دروازہ اس کے لئے بند ہے اور پھر انسانی سعی و کاوش کی کوئی کلید بھی اس بند دروازہ کو نہیں کھول سکتی۔ بات کو سنئے اور فوراً اس کی طرف عمل اور پیروی کے لئے قدم بڑھا دیجئے تو قرآن خوش ہے اور پھر درجہ بدرجہ ایمان اور عمل کی راہوں میں ہم جس قدر استوار اور مضبوط ہوتے جائیں گے اسی قدر اس کی برکتیں ہمارے لئے بڑھتی جائیں گی لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ہم قرآن کی باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں مگر ہمت عمل نہیں رکھتے، یا اپنی خواہشوں کو اس کے احکام کے آگے ترک نہیں کر سکتے، یا محض اس لئے اس کو پڑھنا چاہتے ہیں کہ ہم کو "تحقیق" اور "ریسرچ" کا مذاق ہے یا ہمارے کچھ اپنے خیالات ہیں جن کیلئے قرآن کی سند ڈھونڈنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے محرومی کے سوا قرآن میں اور کچھ نہیں ہے۔

## قرآن کا قانون ہدایت وضلالت:

اوپر ہم نے دو جماعتوں کا ذکر کیا ہے وہ بالکل اصولی تقسیم تھی قرآن مجید نے اس سے زیادہ بسط و تفصیل کے ساتھ ہم کو بتایا ہے کہ کس قسم کے لوگ ہیں جو قرآن سے ہدایت حاصل کرتے ہیں اور کس قسم کے لوگ ہیں جو اس کے فیض سے محروم رہتے ہیں۔

ہدایت وضلالت کے متعلق ایک اصولی حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سرتاسر اللہ کی توفیق اور اس کی توفیق سے محرومی پر منحصر ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماتا ہے وہ اس کتاب سے فیض اٹھاتے ہیں اور جن لوگوں کو وہ اپنی توفیق سے محروم کر دیتا ہے وہ اس فیض سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس ضابطہ کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| كِتٰبٌ أَنزَلْنٰهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ | یہ کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اس لئے |
| النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّورِ | اتاری ہے کہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر |

بِـاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِـرَاطِ الْعَزِيْـزِ الْحَمِيْدِ. (۱)

روشنی کی طرف لاؤ، ان کے رب کے اذن سے، خدائے عزیز وحمید کے راستہ کی طرف۔

یعنی قرآن مجید کا مقصد لوگوں کو گمراہی وضلالت کی تاریکی سے نکال کر ایمان وہدایت کی روشنی میں لانا ہے اور یہ کام ایک مخصوص قانون کے مطابق انجام پاتا ہے۔ کیوں کہ فرمایا ہے ''بِـاِذْنِ رَبِّهِمْ'' یعنی پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جس کو چاہے ایمان وہدایت بخش دے بلکہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے ایمان سے بہرہ ور فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہی کے کھڈ میں گرادیتا ہے اور اس کا یہ چاہنا ایک قانون حکمت کے مطابق ہے، وہ قانون حکمت کیا ہے؟ اس کا جواب قرآن مجید نے متعدد مقامات میں دیا ہے، لیکن سورہ بقرہ کے آخر میں، تعلیم حکمت کے باب میں، اس پر نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس لئے ہم اسی مقام کو اس معاملہ کی توضیح کے لئے منتخب کرتے ہیں فرمایا:

اَللّٰـهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْلِيَآءُ هُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ. اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ. (۲)

اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے کارساز طاغوت بنتے ہیں۔ وہ ان کو روشنی سے تاریکی کی طرف دھکیلتے ہیں، یہی لوگ دوزخی ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یعنی اللہ اور اس کی کتاب کی رہنمائی صرف اہل ایمان کے لئے مخصوص ہے، اہل کفر اس سے محروم ہیں۔ اہل کفر کے رہبر و مددگار طاغوت ہیں، وہ ان کو روشنی میں نہیں آنے

(۱) ابراهیم : ۱

(۲) البقرة ۲۵۷

دیتے، اور اگر کبھی روشنی کی کوئی کرن ان کے سروں پر جھلک بھی جاتی ہے تو ان کے طاغوت فوراً ان کو دھکیل کر تاریکی کے سیاہ پردوں میں چھپا دیتے ہیں کہ کہیں وہ روشنی کے راز سے آشنا نہ ہو جائیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مثال بیان کی ہے جن کو تاریکی سے روشنی کی طرف نکالتا ہے، یا جن کو تاریکی میں چھوڑ دیتا ہے اور اس کے لئے تین شخصوں کو منتخب کیا ہے جو درحقیقت تین جماعتوں کے نمائندے ہیں۔ فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِی حَآجَّ اِبْرَاهِیمَ فِی رَبِّهٖ اَنْ آتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْکَ، اِذْ قَالَ اِبْرَاهِیمُ رَبِّیَ الَّذِی یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ. قَالَ اِبْرَاهِیمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ. وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ. اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا. قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِاْئَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ. قَالَ کَمْ لَبِثْتَ. قَالَ لَبِثْتُ یَوْماً اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ. قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِاْئَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَ شَرَابِکَ لَمْ یَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِکَ

کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اسکے رب کے باب میں اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا، جبکہ ابراہیم نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، وہ بولا میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ یہ بات ہے تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اسے پچھم سے نکال دے تو وہ کافر یہ سن کر بھوچکا رہ گیا اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا یا جیسے کہ وہ جس کا گزر ایک بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی، اس نے کہا کہ بھلا اللہ اس کو اس کے فنا ہو چکنے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اس کو سو سال کی موت دے دی، پھر اس کو اٹھایا۔ پوچھا: کتنی مدت اس حال میں رہے؟ بولا: ایک دن یا ایک دن

وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْماً. فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. وَاذْ قَالَ اِبْرَاهِيمُ رَبِّ اَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتىٰ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ. قَالَ بَلىٰ وَلٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي. قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءاً ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِيْنَكَ سَعْياً. وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ.

(۱)

سے زیادہ کچھ حصہ۔فرمایا: بلکہ تم پورے سو سال اسی حال میں رہے۔اب تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو،ان میں سے کوئی چیز بسی تک نہیں۔اوراپنے گدھے کو دیکھو ہم اس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں تاکہ تمہیں اٹھائے جانے پر یقین ہو اور تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنائیں اور ہڈیوں کی طرف دیکھو کس طرح ہم ان کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔پس جب اس پر حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی وہ پکار اٹھا کہ میں مانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب! مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ فرمایا: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے؟بولا ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہوجائے ۔فرمایا: تو چار پرندے لو اور ان کو اپنے سے ہلالو، پھر انکو ٹکڑے کرکے ہر پہاڑی پر ان کا ایک حصہ رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے

---

(۱) البقرۃ:۲۵۸-۲۶۰

ہوئے آئیں گے اور یاد رکھو کہ اللہ غالب اور
حکیم ہے۔

یہاں ان واقعات کی توضیح کا موقع نہیں ہے جن کی طرف یہ آیات اشارہ کر رہی ہیں۔ہم صرف اس حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہیں جو ان آیات کے اندر مضمر ہے اور جس کی طرف نظم کلام رہنمائی کر رہا ہے۔یہ آیتیں ماسبق آیت اللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا... الآیہ(۱) کے بعد ہی وارد ہیں۔اس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ کون لوگ ہیں جو تاریکی سے روشنی کی طرف آتے ہیں اور کون لوگ ہیں جو روشنی سے تاریکی کی طرف جاتے ہیں۔پس نظم اور اسلوب کلام اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ(۲) (کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے باب میں حجت کی) دونوں مقتضی ہیں کہ ان آیات کا تعلق ماسبق آیت سے ہو۔پھر جب ہم ان آیات کے مضمون پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ آیت ماسبق میں جس بات کو اجمال کے ساتھ بیان فرمایا تھا،ان آیات میں اسی کو پوری وضاحت بلکہ تمثیل کے ساتھ سمجھا دیا ہے کہ کس قسم کے لوگ ہیں جو خدا کی روشنی سے محروم رہتے ہیں اور کون لوگ ہیں جو اسکی ہدایت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔اب آیئے ان آیات کو اچھی طرح تحلیل کر کے سمجھیں۔ان میں غور کرنے سے تین شخصوں کا بیان معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ایک وہ شخص ہے جو حکومت ، دولت اور ملک و سلطنت کے نشہ سے مخبوط ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے اس کے سامنے اللہ کی روشنی پیش کی ہے۔لیکن وہ غرور کی بدمستی میں کسی بات پر غور کرنا نہیں چاہتا ، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات پر فوراً معارضہ کر بیٹھتا ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے معارضہ کا نہایت معقول جواب دیتے ہیں

---

(۱) البقرة : ۲۵۷

(۲) أيضاً: ۲۵۸

اور وہ انکے جواب سے لاجواب بھی ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی اس پر ایمان و ہدایت کی راہ نہیں کھلتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی روشنی طلب گاروں اور ڈھونڈنے والوں کیلئے ہے جو اس سے معارضہ کرتے ہیں ان کی آنکھیں اس سے چندھیا تو جاتی ہیں لیکن اس سے ان پر ایمان کی راہ نہیں کھلتی وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۱)۔

(۲) دوسرا وہ شخص ہے جو علم و ایمان اور یقین و بصیرت کا طلب گار ہے اور ان چیزوں کے حاصل کرنے کے لئے وہ اس طریقہ پر گامزن ہے جو اہل حق کا طریقہ ہوتا ہے۔ وہ علم کے جھوٹے مدعیوں اور مناظرہ بازوں کی طرح بستیوں، مدرسوں، مسجدوں اور خانقاہوں میں مباحثے اور مناظرے کی مجلسیں منعقد نہیں کرتا پھرتا اور نہ یہ کرتا ہے کہ جو خطرہ دل میں گذر جائے اس کو جھٹ چند ورقوں میں چھاپ کر ساری دنیا میں اپنے علم و فضل کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کوشش کرے بلکہ سوچنے والے دماغ اور غور کرنے والی طبیعت کی طرح وہ خلوت کے گوشوں اور تنہائیوں کے ویرانوں کا شائق ہے، وہ بستیوں کے ہجوم سے بھاگتا اور شہروں کے اژدہام سے گھبراتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی مقام عبرت و موعظت کا کوئی خلوت کدہ میسر آجائے تو اپنے ان سوالوں کو لے کر بیٹھ جائے جن کے جواب کے لئے وہ ہمہ وقت تشنہ و بے قرار ہے، چنانچہ اسی طرح کی کسی ڈھئی ہوئی بستی پر اس کا گزر ہو جاتا ہے اس کی منہدم دیوار، اس کے ٹوٹے ہوئے در، اس کی سر بسجود محرابیں اسکی پراگندہ اینٹیں اور اس کی وحشت و ویرانی کی خاموشی اس کے سامنے عبرتوں اور بصیرتوں کا ایک دفتر کھول دیتی ہے اور طبیعت کا ذوق فوراً اپنے لئے فکر و نظر کا موضوع تلاش کر لیتا ہے اور جس سوال پر دماغ بار بار زور آزمائی کر کے عاجز آچکا تھا، لیکن کوئی تشفی بخش حل نہ پا سکا تھا، موقع و ماحول کی تاثیر سے دل کا وہی داغ پھر ابھر آتا ہے، تذبذب کی خلیج اور اضطراب کی چبھن پھر تازہ ہو جاتی ہے اور وہ انکار و ہٹ دھرمی کے غرور کے ساتھ نہیں، بلکہ یکسر ذوق جستجو اور سراپا شوق و آرزو ہو کر پکار

---

(۱) البقرة : ۲۵۹

اٹھتا ہے

اَنّٰی یُحْیِ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِھَا (۱) — بھلا اللہ اس کو اس کے فنا ہو چکنے کے بعد کس طرح زندہ کر دے گا

اگر چہ سوال وہی ہے جو مکہ کے مغروروں اور طائف کے سرکشوں نے کیا تھا اور جس کے جواب میں قرآن نے ان کو جھڑکی سنائی تھی، لیکن سوال کرنے والے کے باطن کی ذہنیت بالکل مختلف ہے۔ وہاں انکار کا گھمنڈ تھا، یہاں تواضع کی مسکینی ہے۔ وہاں مناظرہ اور مجادلہ کا ولولہ تھا، یہاں سوال کی خلش اور اضطراب کی چبھن ہے۔ وہاں حریف کو چپ کرنے کی خواہش کارفرما تھی، یہاں درمان درد اور مرہم زخم مطلوب ہے، یعنی وہ تکذیب تھی یہ سوال ہے وہ انکار تھا، یہ شک ہے، اور ان دونوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔

چنانچہ اس شخص کے ساتھ بالکل مختلف معاملہ ہوتا ہے۔ اس کے شک کے ازالہ کے لئے اسباب کے تمام پردے ہٹا دیئے جاتے ہیں، اور ایک ایسی صورت حال سامنے آجاتی ہے جو شک کے ایک ایک کانٹے کو چن چن کر نکال دیتی ہے او وہ یقین کامل کی روشنی سے معمور ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (۲)

(۳) اس کے بعد تیسرے شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام نمودار ہوتے ہیں۔ یہ فرماتے ہیں اے پروردگار! مجھے تو دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ اٹھا کھڑا کرے گا؟ سوال ہوتا ہے کہ کیا تم اس بات پر ایمان ویقین نہیں رکھتے؟ فرماتے ہیں ایمان ویقین تو ہے، بھلا ایمان ویقین کیوں نہ ہوگا، تیرے علم وقدرت سے کیا بعید ہے، تو تو سب کچھ کر سکتا ہے لیکن اے رب! میں ایمان ویقین سے کچھ زیادہ چاہتا ہوں، میں شرح صدر کا

---

(۱) البقرۃ: ۲۵۹

(۱) أیضا: ۲۵۹

بھوکا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ انوار بصیرت کے دریا میں ڈوب جاؤں ۔ میرا سینہ آفتاب یقین وطمانیت کا ایک ابدی ودائمی مطلع بن جائے ، میں جو کچھ بصیرت سے سمجھا ہوں ،اس کو بصارت سے بھی دیکھ لوں ،اس کی معرفت میں بالکل غرق ہوجاؤں، اس کے رنگ میں بالکل رنگ جاؤں ،لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (۱)۔

یہ حالت اوپر کی دونوں حالتوں سے مختلف ہے یہ نہ تو انکار اور غرور کی حالت ہے نہ شک واضطراب کی بلکہ یہ شرح صدر کی طلب ہے اور اللہ تعالیٰ انکے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے کہ ان کا دل اطمینان ویقین کی دولت سے مالا مال ہوجاتا ہے اور ان کی بصیرت کے سامنے سے تمام حجابات یک قلم ہٹ جاتے ہیں۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ یہ تین شخص درحقیقت تین جماعتوں کے نمائندے ہیں اور خدا کی روشنی ان تینوں جماعتوں کے ساتھ تین مختلف قسم کے معاملے کرتی ہے۔ایک جماعت متکبرین کی ہے،ان کی نگاہوں کونورالٰہی صرف خیرہ کردیتا ہے،ایمان وبصیرت نہیں بخشتا۔دوسری جماعت ارباب شک واضطراب کی ہے ،خدا کی روشنی انکو تشفی وطمانیت بخشتی ہے۔تیسری جماعت طالبین شرح صدر کی ہے،اللہ تعالیٰ انکے سینوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔

یہ عام سنۃ اللہ کا بیان ہے ۔شقاوت وسعادت اور ہدایت وضلالت کا وہ قانون جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ، یہی ہے اور بالکل ٹھیک یہی حالت قرآن مجید کے فکرو تدبر میں ایک طالب قرآن کو پیش آتی ہے ۔اگر ایک شخص قرآن مجید سے جھگڑنا چاہے اور یہ حوصلہ لے کر اٹھے کہ اس کی دلیلوں سے لڑائی لڑے گا اور اس کی نصیحتوں سے جھگڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر قرآنی ہدایات کا دروازہ بند کردیتا ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہے جو کسی شک و شبہ کی خلش سے بے چین ہے اور چاہتا ہے کہ قرآن اس کے شبہات دور کردے تو قرآن اس کی رہبری کرتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کو یقین وبصیرت کی منزل تک پہنچادیتا ہے۔

---

(۱) البقرۃ: ۲۶۰

قرآن مجید اور صاحب وحی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ابتدائی احوال اس حقیقت کو پوری طرح کھول دینے کیلئے بالکل کافی ہیں ۔نبوت سے قبل لیکن بعثت کے بالکل قریب آنحضرت ﷺ کا کیا حال تھا؟ ایک گمراہ اور آوارہ دنیا کے اندر، جسکے اوپر اور نیچے صرف تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی ،آپ ایک روشنی کے لئے بے قرار تھے ،ایسی روشنی جو ہدایت اور نجات کی بند راہوں کو دنیا کیلئے کھول دے ،جو عقل و دل کی بصیرتوں کو جگمگا دے، جو شبہات کی تاریکیوں کو مٹا دے اور اس کائنات کے معمہ کو، جس پر ہزار ہا حجابات اور پردے پڑے ہوئے ہیں حل کر کے سمجھا دے ۔اندرونی خلشوں اور باطنی کاوشوں نے آپ کو یکسر درد بنا دیا تھا، آپ سراپا طلب و جستجو اور یکسر شوق و آرزو ہو کر، بستی سے متنفر اور آبادی سے بیزار ہو گئے تھے۔ایک صحراء کے اندر، ایک پہاڑ کے غار میں معتکف ہو کر منتظر تھے کہ سامنے کے پردے چاک ہوں، اور حقیقت منتظر جلوہ آرا ہو، طلب و جستجو کی یہ نیازمندی، شوق و آرزو کی یہ فروتنی اور فکر و تدبر کی یہ خلوت گزینی اور غار نشینی تھی جب اِقْــرَا (۱) کا پیام آیا اور خدا نے اپنے سربزانو بندہ کو اٹھایا اور اس پر اپنے فضل کا یوں اظہار فرمایا وَوَجَدَکَ ضَالاًّ فَهَدیٰ (۲) (اس نے تم کو تلاش حقیقت میں سرگرداں پایا تو ہدایت بخشی)

پس طالب قرآن کی ابتدا اور انتہا دونوں صرف طلب و جستجو اور عجز و فروتنی ہے، بے نیازی، استکبار، مجادلہ اور معارضہ کے ساتھ اس سفر کی ایک منزل بھی طے نہیں ہو سکتی، قرآن کی طرف آدمی کا قدم صرف اسلئے اٹھنا چاہیے کہ اس کو حقیقت کی طلب ہے اور جب تک حقیقت نہ مل جائے طالب کو چاہئے کہ وہ قرآن کے اندر معتکف رہے اور فکر و تدبر کا جہاد جاری رکھے۔شبہات کتنے ہی اہم ہوں اور مشکلات کتنی ہی کٹھن، لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی

---

(۱) العلق : ۱

(۲) الضحیٰ : ۷

مایوس نہ ہو جو شخص خلوص نیت کے ساتھ طلب علم اور جستجوئے رشد وہدایت کی راہ میں جہاد کر رہا ہے، اس کی کامیابی یقینی ہے،

وَ الَّذِیْ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (۱)
اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔

اس کے اطمینان وبصیرت کے لئے خدائے کارساز وکریم دشوار کو سہل، بلکہ ناممکن کو ممکن کر دے گا اور اسکو ہدایت وایمان کی غذا اس گوشہ سے ملے گی جس گوشہ کا اسکو کبھی وہم و گمان بھی نہ گذرا ہوگا،

وَیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ. (۲)
اور اللہ ان کو وہاں سے رزق دے گا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ ہوگا۔

اور پھر اگر قرآن پر آدمی ثابت قدم رہے تو وہ نعمت عظمیٰ جس کو ہم نے شرح صدر سے تعبیر کیا ہے اور جس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواہش کی تھی، وہ بھی اس کو ملتی ہے۔ چنانچہ قرآنی تعلیمات کے ظہور وکمال کے بعد اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلعم سے فرمایا

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (۳)
کیا ہم نے تمہارے سینے کو کھول نہیں دیا؟

اس سلسلہ کی ایک نہایت لطیف حقیقت سورہ مجادلہ میں بیان ہوئی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے دو جماعتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک جماعت کا حال یہ ہے کہ جب دینی احوال و معاملات میں اس کو کوئی مشکل، کوئی دشواری، کوئی شبہ یا کوئی رکاوٹ پیش آتی ہے تو وہ خدا سے مجادلہ اور رسول سے شکوہ کرتی ہے۔ لفظ مجادلہ، عربی زبان میں جس طرح جھگڑنے کے

(۱) العنکبوت: ۶۹

(۲) الطلاق: ۳

(۳) الم نشرح: ۱

معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح اس اصرار کیلئے بھی بولا جاتا ہے جس کی بنیاد محبت، اعتماد اور خلوص پر ہو۔ یعنی وہ جماعت خدا اور رسول پر اعتراض یا نکتہ چینی نہیں کرتی اور نہ قرآن و حدیث کا مذاق اڑاتی، بلکہ اپنے شبہات وشکوک، محبت واعتماد کے ساتھ عرض کرتی ہے اور ان کا حل چاہتی ہے۔ دوسری جماعت وہ ہے جس کی خصوصیت محادہ ہے۔ محادہ کے معنی اختلاف کے ہیں یعنی اس کی اصلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ خدا اور رسول کی مخالفت اور انکی باتوں پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں اور قسم قسم کے شبہات وارد کرے۔

پہلی جماعت کی نمائندہ ایک عورت ہے جو ایک مخصوص دینی معاملہ کی وجہ سے سخت کشمکش میں پڑ گئی ہے، لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس کشمکش کو مذہب پر زبان درازی کا بہانہ بنالے، اپنی مشکل کو نہایت لجاجت اور عاجزی کے ساتھ خدا اور رسول کے حضور میں عرض کرتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی عرض کو سنتا ہے اور اسکی مشکل کو دور کر دیتا ہے۔

| | |
|---|---|
| قَد سَمِعَ اللّٰهُ قَولَ الَّتِی تُجَادِلُکَ | اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو تم سے |
| فِی زَوجِهَا وَ تَشتَکِی اِلَی اللّٰهِ | جھگڑتی تھی اپنے شوہر کے بارے میں اور |
| وَ اللّٰهُ یَسمَعُ تَحَاوُرَکُمَا. اِنَّ اللّٰهَ | شکوہ کر رہی تھی اللہ سے اور اللہ سن رہا تھا تم |
| سَمِیعٌ بَصِیرٌ (۱) | دونوں کی گفتگو۔ اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ |

دوسری جماعت منافقین کی ہے۔ ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ ہمیشہ اس گھات میں رہتے ہیں کہ کوئی بات اعتراض اور نکتہ چینی کی پائیں اور اسکو لے اڑیں۔ ان کی نسبت فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِینَ یُحَادُّونَ اللّٰهَ وَ رَسُولَهٗ | جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف |
| کُبِتُوا کَمَا کُبِتَ الَّذِینَ مِن قَبلِهِم | محاذ آرائی کر رہے ہیں وہ ذلیل ہوں گے |

---

(۱) المجادلة : ۱

وَقَد اَنزَلنَا آیَاتٍ بَیِّنٰتٍ وَ لِلکَافِرِینَ عَــــذَابٌ مُهِیـــــنٌ(۱) جس طرح ان سے پہلے ان کے ہم مشرب ذلیل ہوئے۔اور ہم نے نہایت واضح تنبیہات اتاردی ہیں اور کافروں کے لئے نہایت سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

سورہ مجادلہ کے اندران دونوں جماعتوں کا ذکر دو مقابل جماعتوں کی حیثیت سے آیا ہے اور اسکا مقصود محض لوگوں کو اس بات کی تعلیم دینا ہے کہ خدا اور رسول کے ساتھ معاملہ کرنے کا طریقہ عرض و معروض اور شکوہ والتجا ہے، نہ کہ محادہ اور مشاقہ ، پس خدا کے دین ، یا اس کی کتاب میں اگر کوئی مشکل پیش آئے تو اس کی راہ صرف یہی ہے کہ اس کو خدا ہی کے سامنے پیش کرے اور اسی سے تسلی و تشفی اور فتح باب کا متمنی ہو۔ یہ نہ کرے کہ جھٹ اس کو ذریعہ اعتراض و نکتہ چینی بنا کر ایک نیا دین کھڑا کردے ، یا اس کو تراش خراش کر اپنی خواہشوں کے سانچہ میں ڈھال دے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان پر قرآن کی راہ نہیں کھلتی۔ وہ یا تو کتاب الٰہی پر نکتہ چینی کرتے کرتے اس سے اس قدر دور ہو جاتے ہیں کہ پھر اس کی طرف لوٹنے کا ان کیلئے امکان ہی نہیں باقی رہ جاتا۔یا قرآنی آیات کی تراش خراش کے معاملہ میں وہ اس قدر چابکدست ہو جاتے ہیں کہ آہستہ آہستہ قرآن کی ہر بات کو اپنی خواہشوں کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ اور ان پر بالکل وہ حالت طاری ہو جاتی ہے جو یہود پر طاری ہو چکی تھی کہ انہوں نے خدا کی ساری کتاب کو اپنی خواہشات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا۔

## تقویٰ اور عمل:

قرآن مجید کے فہم اور تدبر کے لئے ایک نہایت اہم اور ضروری شرط تقویٰ بھی ہے۔سورہ بقرہ کی دوسری ہی آیت میں فرمایا ہے:

(۲) المجادلۃ ۵۸:۵

| | |
|---|---|
| ذٰلِکَ الکِتَابُ لَارَیبَ فِیہِ ھُدیً لِلمُتَّقِینَ.(۱) | یہ کتاب الٰہی ہے اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے۔ |

سورہ لقمان میں فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| تِلکَ آیٰتُ الکِتَابِ الحَکِیمِ. ھُدیً وَ رَحمَۃً لِلمُحسِنِینَ.(۲) | یہ پر حکمت کتاب کی آیات ہیں، ہدایت و رحمت بن کر نازل ہوئی ہیں خوب کاروں کے لئے۔ |

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں بے شمار ہیں اور ایک طالب علم کو ہر جگہ یہ بات کھٹکتی ہے کہ قرآن مجید کی ہدایت متقین و محسنین ہی کے لئے کیوں مخصوص ہوئی؟ جو شخص بھی اس کو پڑھے، چاہئے کہ قرآن اس کی ہدایت کرے، عام اس سے کہ وہ متقی ہو یا غیر متقی، شقی ہو یا سعید، محسن ہو یا غیر محسن؟ لیکن قرآن مجید کو اس بات پر اصرار ہے کہ اس کا دروازہ صرف انہی لوگوں کیلئے کھلے گا، جو تقویٰ اور احسان کی صفتوں سے متصف ہوں گے، آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ بات ہمارے مفسرین کو بھی کھٹکی ہے اور انہوں نے اس کو حل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ لیکن معاملہ کا ایک خاص پہلو ہے۔ جس کی طرف لوگوں نے توجہ نہیں کی اور اصل حقیقت اس وقت تک بے نقاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔

قرآن مجید کے متعلق یہ امر مسلم ہے کہ وہ انسان کے روحانی ارتقاء کا آخری زینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی درجہ بدرجہ فرمائی ہے۔ ہدایت کا پہلا درجہ ہدایت جبلت اور ہدایت فطرت ہے۔ جس کا ذکر الَّذِی قَدَّرَ فَھَدیٰ(۳) اور فَاَلھَمَھَا فُجُورَھَا وَ تَقوٰھَا(۴) وغیرہ مختلف آیات میں فرمایا ہے۔ یہ آنکھ کان، دماغ اور دل کی

البقرۃ ۲: ۲ (۲) لقمان: ۲-۳

(۳) الأعلیٰ: ۳ (۴) الشمس: ۸

رہنمائی، وجدان و ذوق اور ادراک و تعقل کی ہدایت ہے۔ یہ فطرت کی وہ عام بخشش ہے جس میں تمام بنی آدم یکساں شریک ہیں۔ بلکہ اس کے ایک حصہ کا فیضان تو اس قدر عام ہے کہ حیوانات تک اس سے بہرہ مند ہیں۔ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ مرغی کے بچے دانہ چگتے ہیں، بطخ کے بچے انڈے سے نکلتے ہی پانی میں تیرنے لگتے ہیں، بلی کے بچے، ابھی آنکھیں نہیں کھلی ہیں لیکن جانتے ہیں کہ انکی غذا کا سرچشمہ اور پرورش کا سامان کہاں ہے۔ انسان اس مرحلہ میں حیوانات کے بالکل ساتھ ساتھ ہے لیکن اس کو شرف و امتیاز کا ایک خاص درجہ بھی حاصل ہوا ہے یعنی وہ وجدان و ذوق اور ادراک و تعقل کے شرف سے بھی ممیز ہے۔ اس کی فطری رہنمائی صرف اسی قدر نہیں ہے کہ وہ کھالے، پی لے اور سو رہے بلکہ انکی مدد سے وہ اپنے کاموں میں ایک نظم و ترتیب پیدا کرتا ہے، جزئیات سے کلیات بناتا ہے، برے بھلے میں امتیاز کرتا ہے اور اختیار و ارادہ کی آزادی اور اپنی ذاتی قوت فیصلہ سے شر کو چھوڑتا اور خیر کو اختیار کرتا ہے۔

اس مرحلہ کے بعد ہدایت و رہنمائی کا دوسرا درجہ ہے جو انبیاء و رسل کی بعثت سے ظہور میں آیا ہے۔ اس مرحلہ میں انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ تمام تر انہی کلیات و مبادی پر مبنی ہے جن سے وہ ہدایت کے پہلے درجے میں سرفراز ہوا ہے۔ جس طرح بیج کے چند دانوں سے ہم ایک پورا لہلہاتا چمن تیار کر لیتے ہیں یا چند گٹھلیوں کو بو کر ایک پورا سرسبز و شاداب باغ اگا لیتے ہیں اسی طرح کشت فطرت کے چند دانوں کو باران رحمت کی پرورش، باغبان فطرت کی رکھوالی اور انبیاء و رسل کی سعی و کاوش نے ایک چمن بنا دیا اور اس کا نام شریعت ہوا۔

لیکن فطرت کے اس عام دستور کے مطابق، جو اسکے تمام کاروبار کی خصوصیت ہے یہ کام بتدریج عمل میں آیا، ایک ہی مرتبہ میں انجام نہیں پا گیا۔ پہلے کچھ انبیاء آئے جنہوں نے فطرت کی زمین کو ہموار کیا پھر دوسرے آئے جنہوں نے اس زمین پر ایک داغ بیل ڈالی، پھر اور لوگ آئے جنہوں نے اس داغ بیل پر بنیادیں استوار کیں، پھر اور آئے جنہوں نے

ان بنیادوں پر دیواریں بلند کیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو بھیجا جنہوں نے اس عمارت کو مسقف کیا، یہاں تک کہ عمارت تیار ہوگئی۔ لیکن کونے میں ایک آخری اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی اور وقت آگیا کہ وہ بھی اپنی جگہ پر رکھدی جائے (۱)۔ چنانچہ وہ بھی اپنی جگہ پر رکھدی گئی اور اعلان کردیا گیا کہ

اَلْیَومَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً. (۲)

اب میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کردیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔

اس عمارت کا نام اسلام ہوا اور اس کا جامع اور مکمل نقشہ ہمارے ہاتھوں میں قرآن مجید ہے۔ یہ قرآن مجید جب اول اول دنیا کے سامنے آیا تو مندرجہ ذیل تین جماعتوں کو اس نے براہ راست مخاطب کیا۔

۱۔ عرب:۔ جن میں بیشتر مشرک تھے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو دین ابراہیمیؑ کی فطری سادگی پر قائم تھے۔

۲۔ یہود: جو اپنی مسلسل شرارتوں اور سرکشیوں کی وجہ سے بالکل مسخ ہو چکے تھے صرف ایک چھوٹی سی جماعت انکے اندر حق پر باقی رہ گئی تھی۔

۳۔ نصاریٰ:۔ انکو بھی ان کے اگلوں کی کجرویوں نے گمراہ کردیا تھا۔ صرف تھوڑے

(۱) حدیث شریف ہے: مثلی ومثل الأنبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتا فأحسنه وأجمله إلا موضع لبنة من زاویة فجعل الناس یطوفون به ویعجبون له ویقولون هل لا وضعت هذه اللبنة فأنا تلک اللبنة وانا خاتم البنیة" صحیح البخاری: ۳۵۳۵، مزید دلائل کے لئے دیکھیں: الذھبی ۲/ ۴۱۸، مسلم: ۱۱۶۷، الترمذی: ۲۵۱۶

(۲) المائدة: ۳

سے لوگ رہ گئے تھے جو صحیح دین مسیح پر قائم تھے۔

ان تینوں جماعتوں میں سے قرآن مجید نے سب سے پہلے عربوں کو مخاطب کیا۔عربوں کی عام اخلاقی زندگی بعض فطری فضائل ومحاسن سے خالی نہ تھی ،لیکن یہ اپنے پیچھے شرک و بت پرستی کی ایک طویل تاریخ رکھتے تھے جس میں انکی طبیعت اور دماغ کا سانچہ اس قدر بدل چکا تھا کہ قرآن مجید کی تعلیمات جو سرتا سر فطری سادگی کے حسن و جمال سے آراستہ تھیں ان میں بڑی مشکل سے سما سکتی تھیں ۔ چنانچہ انکا بڑا طبقہ عرصہ تک قرآن مجید کی تعلیمات سے نہ صرف بیگانہ رہا بلکہ اس کے مٹانے کیلئے پوری طرح زور لگا تا رہا۔البتہ ان لوگوں کو قرآن مجید کے قبول کر لینے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئی جو دین ابراہیمی کی فطری سادگی پر قائم اور شرک و بت پرستی سے پہلے ہی بیزار تھے انہوں نے قرآن مجید کی دعوت سنی تو انکوایسا محسوس ہوا کہ گویا اپنے ہی دل کی آواز سن رہے ہیں ۔پس وہ فوراً اس کی طرف لپکے اور اس کو قبول کرلیا۔ان کو نہ تو معجزات کی ضرورت پیش آئی اور نہ اس بات کی کہ قرآن ان کے سامنے بار بار پیش کیا جائے ۔ یہ پیاسے تھے ،اس وجہ سے جوں ہی انکے سامنے پانی پیش کیا گیا وہ اس کی طرف دوڑ پڑے ۔ان کی آنکھیں طلب ہدایت کے لئے کھلی ہوئی تھیں ،اور جن کی آنکھیں کھلی ہوں ان کو روشنی سے زیادہ عزیز کوئی شے نہیں ہوا کرتی ۔ پس جس طرح آئینہ روشنی میں چمک جاتا ہے، یہ بھی روشنی پا کر چمک اٹھے ۔قرآن مجید نے سورہ نور میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ فطرت اور وحی دونوں ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں ۔ یہ دونوں بندے کو ایک ہی سرچشمہ سے ملتی ہیں ۔صحیح فطرت کی مثال صاف وشفاف روغن کی ہے جو ہر طرح کی آمیزش اور ملاوٹ سے بالکل پاک ہے ۔اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ بغیر اس کے کہ اس کو آگ چھوئے ،بھڑک اٹھنے کے لئے تیار رہتا ہے ۔پس جوں ہی وحی والہام کی چنگاری اس سے مس ہوتی ہے فوراً بھڑک اٹھتا ہے۔

یکاد زیتھا یضیٓء وَلَولَمْ تَمسَسْهُ نَارٌ اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ گویا آگ کے

نُورٌ عَلىٰ نُورٍ يَهْدِی اللّٰهُ لِنُورِهٖ مَنْ يَّشَاءُ.(۱) چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا۔ روشنی کے اوپر روشنی! اللہ اپنے نور کی ہدایت جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے۔

اوپر ہم نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس میں محسنین اور متقین سے ایسے ہی لوگ مراد ہیں۔ احسان کے معنی ایک تو وہی ہیں جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔ دوسرا ایک اور مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنے قول و فعل کو پورے اخلاص و صداقت، پوری ہمت و عزیمت اور نہایت خوبی و کمال کے ساتھ انجام دینا(۲)۔ اہل لغت نے لفظ کی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ احادیث میں بھی احسان کی یہ حقیقت بیان ہوئی ہے اور قرآن مجید نے اسی مفہوم کے اعتبار سے اہل مکہ یا اہل کتاب کی ان جماعتوں کے لئے اس کو استعمال فرمایا ہے جنہوں نے فطرت اور وحی کی روشنی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور باد مخالف کے جھونکوں سے اس کو گل ہونے نہیں دیا ہے۔ ایسے لوگوں کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ تعریف فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ انکے عمل کو ضائع نہیں کیا کرتا۔ قرآن مجید ان کے لئے ہدایت و رحمت ہے، یہ اس کو سمجھتے ہیں اور اسکی تعلیمات سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

باقی رہی دوسری جماعت جس نے اپنی فطری صلاحیتیں بالکل برباد کر ڈالی تھیں، تو اس کے لئے قرآن مجید کی تعلیمات بالکل انوکھی تھیں، وہ کسی طرح بھی ان کو سمجھ نہیں سکتی تھیں۔ یہ تعلیمات جن فطری اصولوں پر مبنی تھیں وہ تمام اصول ان کے اندر سے مٹ چکے تھے اور انکی جگہ بالکل غیر فطری معتقدات واوہام نے لے لی تھیں۔ انکی فطرت کا قالب اس درجہ ٹیڑھا ہو چکا تھا کہ کوئی سیدھی چیز اس میں سما ہی نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ جب آنحضرت صلعم نے

(۱) النور :۳۵

(۲) حدیث میں ''احسان'' کی تعریف کے لئے دیکھیں۔ صحیح مسلم :۹۳

ان کے سامنے قرآن مجید پیش کیا تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔اس کے سننے اور سمجھنے سے انکار کر دیا اور انکا یہ انکار درحقیقت انکے بہت سے سابق انکاروں کا لازمی نتیجہ تھا۔انہوں نے ہدایت کے ابتدائی مراحل میں اس کو قبول کرنے سے اعراض کیا، اسلئے بعد کے مرحلوں میں بھی اسکا ساتھ نہ دے سکے۔اور ایسا ہونا قدرتی تھا، ایک طالب علم درجہ بدرجہ ہی علم کی راہوں میں بڑھتا ہے، جس نے ایک فن کے ابتدائی قواعد خوب نہ سمجھ لئے ہوں اور ان کی پوری مشق نہ کر لی ہو وہ ہرگز اس فن کے انتہائی مسائل نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ یہی حال ان لوگوں کا ہوا۔انہوں نے رشد وہدایت کی ابجد ہی نہیں سیکھی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہدایت کا آخری صحیفہ نازل ہوا تو وہ اس کے سمجھنے سے بالکل قاصر رہ گئے۔قرآن مجید نے سورہ اعراف میں اس معاملہ کی پوری تشریح کر دی ہے۔

تِلْکَ الْقُرٰی نَقُصُّ عَلَیْکَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا وَ لَقَدْ جَآئَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا کَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا کَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الْکٰفِرِیْنَ.(۱)

یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتوں کا کچھ حصہ ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ان کے پاس ہمارے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ ایمان لانے والے نہ بنے بوجہ اسکے کہ وہ پہلے سے جھٹلاتے رہے تھے۔اسی طرح اللہ ٹھپہ لگا دیا کرتا ہے کافروں کے دلوں پر۔

یعنی ان لوگوں کا یہ تازہ انکار بہت سے سابق انکاروں کا ثمرہ ہے۔سابق انبیاء نے ان کو جو سبق پڑھائے انہوں نے ان سب سے اعراض کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ سبق بھی ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔یہی چیز ہے جس کو قرآن مجید اپنی اصطلاح میں ''ختم قلوب'' (۲)

---

(۱) الاعراف : ۱۰۱

(۲) ''ختم قلوب'' پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھیں:۔ تدبر قرآن ۱/ ۱۱۰-۱۱۵، مجلّہ علوم القرآن ۶/۱-۲/۱۱-۱۹

کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے یعنی جو شخص خدا کی بخشی ہوئی ہدایت کو درجہ بدرجہ تمام مراحل میں قبول کرنے سے اعراض کرتا ہے بالآخر اس کا قلب سخت ہو جاتا ہے اور وہ اپنی فہم و بصیرت کی تمام استعدادیں کھو بیٹھتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ خدا کی شریعت عمل کے لئے نازل ہوتی ہے اس لئے اس میں ''علم'' اور ''عمل'' یا ''جاننا'' اور ''کرنا'' دو چیزیں نہیں ہیں اس میں ''جاننا'' بعینہ وہی چیز ہے جس کو ''کرنا'' کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص جانتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا تو وہ جاننا یہاں معتبر نہیں، ایسا جاننا بے سود ہے، اس کی حقیقت اور جہل کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ علم بالکل بے نتیجہ ہے۔ اس علم سے مزید علم و عمل کے دروازے نہیں کھلا کرتے۔ ہم نے محض اپنی غلط فہمی یا کوتاہیٔ تعبیر کی وجہ سے جہل کا نام علم رکھ لیا ہے۔

یہود کے معاملہ میں بھی بالکل یہی صورت حالات پیش آئی۔ یہود کی اکثریت نے، جس نے اپنے تمام انبیاء کی تعلیمات جھٹلا دی تھیں، قرآن مجید کا بھی انکار کر دیا۔ حالانکہ قرآن مجید سے سب سے زیادہ قریب وہی تھے۔ قرآن مجید ہدایت کا آخری زینہ ہے اور وہ اس زینہ سے صرف ایک ہی درجہ نیچے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ وہ اس کو سب سے پہلے قبول کرتے اور نبی ﷺ کے ساتھ ہو کر تمام دنیا میں اسکے حق ہونے کی گواہی دیتے۔ لیکن انہوں نے سب سے پہلے اس کا انکار کیا اور اس انکار کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید سے پہلے جو ہدایتیں نازل ہوئی تھیں وہ ان سب کا انکار کر چکے تھے اور سنت الٰہی کے لحاظ سے قرآن مجید کو قبول کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ پچھلی تمام ہدایتوں کو قبول کر چکے ہوتے۔

اصولی طور پر یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بالکل ابتدا ہی میں فرما دی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو چند امتحانوں میں جانچا اور جب وہ ان میں پورے اترے تو فرمایا:

إِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ إِمَامًا(۱) (میں تم کولوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔) انہوں نے سوال کیا۔ وَمِنْ ذُرِّیَّتِی(۲) (اور میری ذریت میں سے یارب؟) جواب ملا: لَا یَنَالُ عَهْدِی الظَّالِمِیْنَ (۳) (میرا عہد ظالموں سے متعلق نہیں) یعنی میرا عہد صرف ان سے متعلق ہے جو برابر میری ہدایت پر قائم رہیں، اس کو ہر مرحلہ میں قبول کریں اور شرک و بت پرستی سے بچتے رہیں یہی لوگ خدا کی ہدایت سے جلد سرفراز ہوں گے اور قوموں کی امامت پائیں گے۔

یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں دوہرائی گئی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کیلئے دعا فرمائی۔

وَاکْتُبْ لَنَا فِی هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَیْکَ. (۴)

اور تو ہمارے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی، ہم نے تو تیری طرف رجوع کیا۔

جواب میں ارشاد ہوا:

عَذَابِی أُصِیْبُ مَنْ أَشَاءُ وَرَحْمَتِی وَسِعَتْ کُلَّ شَیْئٍ. فَسَأَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ. (۵)

میں اپنے عذاب میں اسی کو مبتلا کرتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو عام ہے۔ سو میں اس کو ان لوگوں کے لئے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے۔

''تقویٰ اختیار کریں گے'' یعنی وہ لوگ جو اس عہد پر، جو آج ان سے باندھا جارہا

(۱) البقرة : ۱۲۴ (۵) أیضا : ۱۵۶
(۲) أیضاً : ۱۲۴
(۳) أیضاً : ۱۲۴
(۴) الأعراف : ۱۵۶

ہے، قائم رہیں گے اور اسکی حرمت کو بٹہ نہیں لگائیں گے، وہی لوگ آئندہ خدا کی رحمت کے مستحق ہوں گے، یعنی جب خدا کی آخری شریعت جو اس دنیا پر خدا کی آخری اور سب سے بڑی رحمت ہوگی آئے گی تو وہ اس کو قبول کریں گے۔ اس کا انکار نہیں کریں گے، اور جو اس عہد پر قائم نہ رہیں گے وہ آئندہ نازل ہونے والی رحمت سے بھی محروم رہیں گے کیونکہ انکے دل سخت ہو جائیں گے اور ان کے کفران نعمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انکے دلوں پر مہر کر دے گا۔ چنانچہ جب قرآن مجید نازل ہوا اور اسکی وہ سورہ اتری جو سرتاسر یہود کو مخاطب کر رہی ہے، یعنی سورہ بقرہ، تو اس کی دوسری ہی آیت میں فرمایا کہ هُدىً لِلْمُتَّقِينَ (۱) (یہ کتاب متقین کے لئے، ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے) یعنی اس کو صرف وہی لوگ قبول کریں گے جو متقی ہیں، جنہوں نے اپنے عہد و پیمان کو قائم رکھا ہے، جنہوں نے خدا کی نعمت کی قدر کی ہے، جنہوں نے اپنے انبیاء کی تعلیمات کو یاد رکھا ہے۔ باقی رہے وہ لوگ جنہوں نے ان تمام چیزوں کا انکار کر دیا ہے وہ اس قرآن کا بھی انکار کر دیں گے۔ کیونکہ انکے فسق و نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔

| | |
|---|---|
| إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَآءٌ عَلَيهِمْ | جن لوگوں نے کفر کیا، انکے لئے یکساں ہے |
| أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ. | ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں |
| خَتَمَ اللّٰهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَ عَلَىٰ | اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر |
| سَمْعِهِمْ وَ عَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَ | مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے |
| لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ | اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔ |

(۲)

جو خدا سے عہد باندھ کر توڑ چکے ہیں، جو خدا کے قائم کئے ہوئے رشتہ پر مقراض چلا

(۱) البقرة : ۲

(۲) أيضاً : ۶-۷

چکے ہیں، جو زمین پر خدا کے قانون حق و عدل کے دشمن ہیں، وہ ہرگز قرآن کی ہدایت نہیں قبول کریں گے۔ وہ تو اس سے بجائے ہدایت پانے کے اپنی گمرہی اور شرارت میں اور بڑھ جائیں گے اور انکی شقاوت و بدبختی پر آخری مہر لگ جائے گی۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْراً وَ يَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْراً. وَمَا يُضِلُّ بِهٖ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ. (۱)

اس کے ذریعہ سے اللہ بہتوں کو گمراہ کرتا کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے، اور نہیں گمراہ کرتا ہے اسکے ذریعہ سے مگر ان لوگوں کو جو نافرمان ہیں، جو اللہ کے عہد کو پکا کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسکو کاٹتے ہیں وہی لوگ نامراد ہیں۔

اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔ خدا کی ہدایت ایک نعمت ہے اور یہ نعمت اسی شخص کو ملنی چاہیے جو اسکی قدر کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔ جو شخص نعمت کی ناقدری کرتا ہے وہ ہرگز مزید نعمت پانے کا مستحق نہیں ہے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہ قانون ہمیشہ سے اٹل ہے، جنہوں نے نعمتوں کو قبول کیا ان کے لئے نعمتیں بڑھتی گئیں اور جنہوں نے ان کی ناقدری کی وہ ان سے محروم ہو گئے۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قانون سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا اور اسی کے مطابق انکے ساتھ معاملہ کیا۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِىْ لَشَدِيْدٌ. (۲)

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم شکر گزار رہے تو میں تمہیں بڑھاؤں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا

(۱) البقرۃ :۲۶-۲۷

(۲) ابراھیم :۷

عذاب بھی بڑا سخت ہوگا۔

پس چونکہ بنی اسرائیل نے اللہ کی بخشی ہوئی نعمت کی قدر نہیں کی تھی اس وجہ سے وہ قرآن کی نعمت سے بہرہ مند ہونے کے مستحق نہیں ٹھہرے، اور جیسا کہ فرمایا گیا تھا ''جو ایک پیسہ میں چور ہے اس کو ایک لاکھ کی امانت نہیں سونپی جائے گی'' وہ قرآن کی عظیم الشان امانت سے محروم رہے، ان کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا جب اس میں وہ راست باز اور امین نہیں ثابت ہوئے تو خدا ان کو اپنی پوری کتاب کیسے سونپ دیتا۔

پس یہود کا بڑا حصہ جو توراۃ وانجیل کی تعلیمات کو چھوڑ کر شہوات نفس اور رغبات دنیا کا شکار ہو چکا تھا، قرآن کے فیض سے بالکل محروم رہا، صرف ایک مختصر سی جماعت ان میں اہل حق کی باقی رہ گئی تھی، یہ لوگ قرآن مجید کی آمد کے منتظر تھے اور جونہی اس کی صدا ان کے کانوں میں پڑی انہوں نے اس کو قبول کر لیا۔ قرآن مجید نے جہاں جہاں یہود کی عام بدبختی کا ذکر کیا ہے وہاں اس چھوٹی سی جماعت کی حق پسندی کی تعریف بھی فرمائی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی حال نصاریٰ کا ہوا۔ انکی جماعت کے بڑے حصہ نے، جو اپنے اگلوں کی تقلید و پیروی میں گمراہ ہوکر دین کی اصلی تعلیمات سے محروم ہو چکا تھا، قرآن کو نہیں سمجھا۔ قرآن کی تعلیمات اسکو اپنے افکار و خیالات کے بالکل مخالف نظر آئیں، اس وجہ سے وہ ان کا دشمن بن گیا۔ البتہ وہ لوگ جن میں صحیح تعلیم کی روشنی موجود تھی اور جو حضرت مسیح کے اشارات کی رہنمائی میں اس کیلئے منتظر تھے، انہوں نے جب قرآن کو پایا تو پورے جوش کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ قرآن مجید نے ان کے اس جوش کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاِذَا سَمِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰىٓ اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَمَا لَنَا لَا | اور جب یہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کو پہچان لینے کے سبب ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے |

نُؤمِنُ بِاللّٰہِ وَ مَاجَآءَ نَا مِنَ الْحَقِّ وَ نَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ. (۱)

ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں میں لکھ۔ اور آخر ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہم کو پہنچا ایمان کیوں نہ لائیں جب کہ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیکوکاروں کے زمرے میں شامل کرے گا۔

اس طرح کے تمام صالح العقیدہ نصاریٰ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے ،انہوں نے اپنے عقائد و اعمال مسخ نہیں کئے تھے بلکہ ہوشیار اور مستعد طالب علم کی طرح جو کچھ انکو پڑھایا گیا تھا اس کو پوری طرح محفوظ رکھا تھا اور اب مزید سبق کیلئے بیتاب تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو محسنین کے لقب سے ممتاز کیا۔

فَاَثَابَھُمُ اللّٰہُ بِمَا قَالُوا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَ ذٰلِکَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِیْنَ. (۲)

تو اللہ ان کے اس قول کے صلے میں ان کو ہمیشہ رہنے کے لئے ایسے باغ عطا فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور خوب کاروں کا یہی صلہ ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن مجید کے متعلق جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ ہدایت ہے متقین کے لئے ، یہ ہدایت ہے محسنین کیلئے ،تو اس کا مفہوم اس سے کسی قدر وسیع ہے جو عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے، اس وجہ سے اس کا فہم و تدبر صرف ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہوں۔ اور اس کی شکر گذاری یہ ہے کہ یہ جس مقصد کیلئے انکو

(۱) المائدة :۸۳-۸۴

(۲) أيضاً :۸۵

دی گئی ہے اس مقصد کو پورا کریں۔اس کو دینے کا مقصد یہ ہے کہ اپنی عملی واعتقادی زندگی پر اس کو پوری طرح طاری کریں۔ جوں جوں وہ اس نعمت کے قدر واحترام میں بڑھتے جائیں گے اسی قدر اس کی برکتیں انکے لئے بڑھتی جائیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ پورا قرآن مجید ایک ساتھ نہیں نازل ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا تا کہ امت کی قدردانی اور شکر گزاری کا پورا پورا امتحان ہوجائے ۔جس طرح ایک طالبعلم درجہ بدرجہ کسی فن کو حاصل کرتا ہے اسی طرح امت بھی بتدریج سبقاً سبقاً اسکو سیکھے اور اس کی تعلیمات کو پوری طرح اپنے اندر جذب کرلے۔چنانچہ جو طریقہ قرآن مجید کے نزول کا تھا وہی طریقہ مسلمانوں نے اس کے سیکھنے اور سکھانے کے لئے اختیار کیا،اس کی ایک ایک آیت کو لیتے اس پر فکر وتدبر کرتے ،عملا اس کی مشق وتمرین کرتے اور جب اس کو اپنے عمل و اعتقاد میں پوری طرح گھلا لیتے ،تب آگے قدم بڑھاتے۔علامہ سیوطی کی الاتقان میں ہے۔

وقد قال ابو عبد الرحمن السلمی حدثنا الذین کانوا یقرئون القرآن کعثمان بن عفان و عبد الله بن مسعود وغیرهما انهم کانوا اذا تعلموا من النبی ﷺ عشر آیات لم یتجاوزوها حتیٰ یعلموا مافیها من العلم و العمل قالوا فتعلمنا القرآن و العلم و العمل جمیعا ولهذا کانوا یبقون مدة فی حفظ(۱) السورة.(۲)

ابو عبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ مجھ سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن مجید پڑھتے پڑھاتے تھے ۔مثلا عثمان بن عفان اور عبداللہ بن مسعود وغیرہ کہ ان لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اگر نبی ﷺ سے دس آیتیں بھی پڑھ لیتے ،تو جب تک ان آیات کے تمام علم و عمل کو اپنے اندر جذب نہ کر لیتے ،آگے قدم نہ بڑھاتے۔انہوں نے کہا کہ ہم نے قرآن مجید ... علم ... ساتھ

(۱) ان دونوں روایتوں میں ''حفظ'' کا لفظ فکر وتدبر کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے کہ سلف کی اصطلاح میں اس کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جو ہم ا...

حاصل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ایک
سورہ کے حفظ (یعنی فکر و مطالعہ) میں وہ
برسوں لگا دیتے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق روایتوں میں آتا ہے:

| | |
|---|---|
| ان عبد اللہ بن عمر مکث علی سورۃ البقرۃ ثمانی سنین یتعلمھا۔ ۱ | حضرت عبد اللہ بن عمر مسلسل آٹھ برس تک سورہ بقرہ پر تدبر فرماتے رہے۔ |

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ کا مطالعہ قرآن ہمارے مطالعہ قرآن سے بالکل مختلف تھا۔ وہ قرآن کو صرف علمی حیثیت سے جان لینے کے شائق نہ تھے بلکہ انکی اصل طلب اس کی تعلیمات کی عملی مشق کیلئے تھی اور جب تک ایک آیت کو وہ اپنے علم و عمل کا جزو نہیں بنا لیتے تھے اس وقت تک وہ اس سے آگے نہیں قدم بڑھاتے تھے، اور یہی اس شکر کی اصلی حقیقت ہے جو نعمت کی زیادتی اور برکت کا باعث ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے فہم و بصیرت کو اپنے انوار سے نورانی فرمایا اور صرف اسی کتاب کے علم و عمل سے دونوں جہان کی تمام سربلندیاں ان کو بخش دیں۔

## تدبر قرآن کے داخلی اور خارجی وسائل:

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق ارادہ اور نیت کی درستی اور غایت و مقصد کی پاکی اور طہارت سے تھا جس طرح نماز کیلئے وضو اور نیت کا اخلاص و تزکیہ شرط ہے، اسی طرح قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لئے یہ شرط لازم ہے کہ طالب دل کی سچی پاکی اور ارادہ کی پوری صداقت کے ساتھ اس کی طرف بڑھے، بغیر اس کے قرآن کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ یہ شرطیں خود قرآن مجید نے بیان کی ہیں اور صدیوں کا تجربہ اس حقیقت کی تصدیق کر رہا ہے۔

(۱) الموطا، باب القرآن: ۱۱

اس کے بعد قرآن مجید کے فہم وتدبر کے طریقہ اور اسکے داخلی اور خارجی اسباب و وسائل کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یعنی ایک تو یہ بات کہ قرآن مجید کو کس طرح پڑھنا چاہیے، کتنی مقدار میں پڑھنا چاہیے، کیا کیا ترتیبیں پیش نظر رکھنی چاہئیں، نظم کو کس طرح پکڑنا چاہیے، معانی کو کس طرح سلجھانا چاہیے، مشکلات میں کس طرح جمنا چاہیے، پھیلے ہوئے خیالات کو کس طرح سمیٹنا چاہیے، سمٹے ہوئے خیالات کو کس طرح پھیلانا چاہیے یعنی مختصر الفاظ میں یہ بات کہ قرآن کی مشکلات میں خود قرآن مجید کی رہنمائی سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہیے اور دوسری یہ بات کہ قرآن مجید سے باہر کیا کیا چیزیں ہیں جو قرآن کے فہم وتدبر میں ہماری مدد کرسکتی ہیں اور ان سے کن کن مشکلات میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟

ان تمام سوالات پر یہاں تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں ہے، ہمارے دوسرے مضمون میں انشاءاللہ ان سوالات پر بقدر ضرورت گفتگو ہوگی۔ یہاں صرف پہلے سوال کے ایک حصہ اور دوسرے سوال کے بعض ضروری پہلوؤں کی طرف بالاجمال اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

## قرآن کی تفسیر خود قرآن سے:

قرآن مجید کے فہم وتدبر کے لئے اصلی چیز خود قرآن مجید ہی ہے اس لئے قرآن کے طالب کو چاہیے کہ وہ تمام مشکلات میں پہلے قرآن مجید ہی کی رہنمائی ڈھونڈھے۔ سلف کا مذہب بالاتفاق یہ رہا ہے کہ اَلقُرآنُ یُفَسِّرُ بَعْضَہ، بَعْضاً (۱) (قرآن کا ایک حصہ اس کے دوسرے حصہ کی خود تفسیر کرتا ہے) اور قرآن نے خود اپنی صفت ''کتاباً متشابھاً'' (۲) بیان کی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ہر حصہ دوسرے حصہ سے ملتا جلتا ہے۔ نیز بعض مواقع پر اس امر کی بھی تشریح ہے کہ جس طرح قرآن کا نزول اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

(۱) الاتقان: ۲/۱۹۷ا

(۲) الزمر: ۲۳

،اسی طرح اس کے اجمالات کی تفصیل کرنے کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے اصولی حیثیت سے یہ بات اگر چہ ہر دور میں ارباب تاویل کے پیش نظر رہی ہے لیکن اس معاملہ کی صحیح نوعیت تفصیل و وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے کبھی نہیں آئی اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عموما ارباب تفسیر کو یہ راہ نہایت دشوار نظر آئی اور وہ بعض ایسی وادیوں میں نکل گئے جو فہم قرآن سے نہایت دور کرنے والی تھیں ،حالانکہ فہم قرآن کی کلید خود قرآن ہی ہے ،وہ اپنے تمام اجمالات کی خود تشریح کرتا ہے، وہ اپنے مفہوم و معنی کی تعیین ،اپنے مقاصد و مطالب کی تفسیر اور اپنے نکات و حقائق کی تشریح کے لئے کسی چیز کا محتاج نہیں ہے ، بلکہ قرآنی بلاغت کا یہ ایک عجیب اعجاز ہے اور یقیناً اس آسمان کے نیچے صرف اسی کتاب عزیز کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے اکثر مشکل الفاظ اور دقیق اسالیب کے حل کے لئے بھی اپنے اندر مثالوں اور نظائر کا ایک قیمتی ذخیرہ رکھتی ہے۔افسوس ہے کہ یہاں تفصیل میں پڑنے کی گنجائش نہیں ہے ،ورنہ ہم دکھاتے کہ کس طرح قرآن مجید عام بول چال کے اندر سے ایک معمولی لفظ اٹھالیتا ہے اور اس کو اس کے معروف استعمال سے کہیں زیادہ بلند معنی میں استعمال کرتا ہے اور پھر اپنے طریق استعمال کے تنوع سے اس کے لئے ایک ایسا مخصوص ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ لسان العرب اور صحاح جوہری کی رہنمائی کے بغیر قرآن کا ایک طالب اس لفظ کے پورے ما لہ و ما علیہ کو اس طرح سمجھ لیتا ہے کہ کوئی چیز بھی اس کے یقین کو جھٹلا نہیں سکتی۔

مفرد الفاظ کے علاوہ اسالیب کلام اور نحوی تالیف وغیرہ کے باب میں بھی قرآن مجید کا یہی حال ہے۔ارباب نحو قرآن مجید کی جن ترکیبوں میں نہایت الجھے ہوئے ہیں اور کسی طرح ان کو نہیں سلجھا سکے خود قرآن مجید میں ان کی مثالیں ڈھونڈ ھئے تو ایک سے زیادہ مل جائیں گی اور پیش وعقب کے ایسے دلائل و قرائن کے ساتھ مل جائیں گی کہ ان کے بارہ میں ہمارے اطمینان کو کوئی چیز مجروح نہیں کرسکتی۔

باقی رہیں قرآن مجید کی تعلیمات ،اس کے تاریخی اشارات ،اس کی مخفی تلمیحات ،تو یہ تو

ایسی چیزیں ہیں جن کے باب میں ہر گروہ نے القرآن یفسر بعضہ بعضا کے اصول کو تسلیم کیا ہے۔اس باب میں لوگوں سے جو کوتاہی ہوئی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ پوری دیدہ ریزی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ جتنا لوگوں نے کر دیا لوگ اسی پر قانع ہو گئے۔ حالانکہ اس میں بہت وسعت ہے اور قرآن مجید کے شواہد اس قدر مختلف شکلوں میں اور اس قدر کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ ہر بات کو واضح کر دینے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ پس جو لوگ قرآن مجید پر تدبر کرنا چاہیں ان کو چاہیے کہ وہ قرآن مجید ہی کو مضبوط پکڑیں اور اس کی ہر مشکل کو خود اسی کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کریں۔

## تفسیروں کی نوعیت:

ہمارے نزدیک یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید کے مطالعہ میں تفسیروں کو مقدم رکھا جائے۔اس راہ میں طرح طرح کے خطرے ہیں۔ہم تفسیروں کی حالت میں آگے بحث کریں گے۔ ہمارے پاس جو تفسیریں ہیں وہ دو ہی قسم کی ہیں؛ یا تو وہ کسی خاص اسکول کی ترجمانی کر رہی ہیں یا وہ روایات اور اقوال سلف کے تمام رطب و یابس کا مجموعہ ہیں۔ایک حقیقی طالب کی راہ میں یہ دونوں چیزیں روک ہو سکتی ہیں۔طالب قرآن جب انکے چکر میں پھنس جاتا ہے تو اس کی جستجو اور تحقیق کی روطبعی نہیں رہ جاتی ، مصنوعی اور غیر طبعی ہو جاتی ہے۔ وہ اس راہ پر پڑ جانے کے بعد قرآن کے لفظوں کی رہنمائی سے محروم اور اس کا مذاق آہستہ آہستہ دوسروں کے خیالات و افکار سے مغلوب ہو جاتا ہے۔پس صحیح راہ یہی ہے کہ آدمی ان چیزوں میں سے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے ۔صرف قرآن کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنائے۔اس کی ایک ایک آیت بلکہ ایک ایک لفظ پر تدبر کرے، ٹھیک مفہوم متعین کرے، طبیعت میں جو سوال پیدا ہو اس پر بار بار غور کرے، جو بات سمجھ میں آئے اس کے نظائر و شواہد تلاش کرے، سیاق و سباق سے اس کی مطابقت معلوم کرے، نظم کے اعتبار سے اس کا موقع و محل دیکھے، عمود کلام کے ں ا سے اس کی مناسبت کو جانچے، پھر اس پر خود اخ ،طرف

سے شکوک وشبہات وارد کرے اور جب دیکھ لے کہ اس نے جو بات سمجھی ہے بالکل پکی ہے، اس میں کسی پہلو سے کوئی خامی نہیں ہے، تب تفسیروں میں اس کو دیکھے اور ہمیشہ صحیح روایات پر نگاہ رکھے۔ ضعیف اور کمزور روایات کو، جن سے کتب تفسیر بھری ہوئی ہیں، کبھی ہاتھ نہ لگائے۔ انشاءاللہ صحیح روایات سے اس کی تائید ہوگی اور اپنے دل میں ایک ایسی خوشی کا جوش محسوس کرے گا جس میں اطمینان، بلندی، اعتماد اور عشق ومحبت قرآن کی نہیں معلوم کتنی کیفیتیں ملی ہوئی ہوں گی۔

لیکن فرض کیجئے یہ سارے جتن کرنے کے بعد آپ کسی آیت کے باب میں ایک نتیجہ تک پہنچے اور جب تفسیر کی کتابوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ صحیح حدیثیں اور سلف کے اقوال آپ کے اختیار کردہ مطلب کے خلاف ہیں اور کوئی ادنیٰ تائید بھی آپ کے ساتھ نہیں ہے تو اس وقت کیا کریں گے؟ کیا روایات اور اقوال سلف کو چھوڑ کر اپنی بات پر جم جائیں گے؟ نہیں! طالب صادق کی راہ یہ نہیں ہے بلکہ آپ ان احادیث اور اقوال کی روشنی میں اپنی تاویل پر دوبارہ غور کریں گے۔ اس صورت میں گمان غالب تو یہی ہے کہ اگر آپ غلطی پر ہوں گے تو آپ کی غلطی خود واضح ہو جائے گی، لیکن فرض کیجئے آپ نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا مگر آپ کو اپنی ہی تاویل صحیح معلوم ہوتی ہے، اب کیا کریں گے؟ اب خود حدیث پر غور کریں گے۔ اس کو ہر پہلو سے پرکھیں گے۔ ہر کسوٹی پر جانچیں گے، انشاءاللہ یہ چیز مفید ثابت ہوگی۔ یا تو آپ کی تاویل کا ضعف واضح ہو جائے گا، یا حدیث کی اصل حقیقت واضح ہو جائیگی، لیکن طالب کے لئے یہ مرحلے نہایت سخت ہیں۔ ان میں صبر وثبات کی ضرورت ہوتی ہے، عجلت اور تیز گامی اس منزل میں معصیت ہے۔ اس طرح کے مواقع پر عرصہ تک توقف کرنا چاہیے اور پھر سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے۔ جب قلب پوری طرح سے ایک بات کے لئے کھل جائے، کسی طرح کی بھی کوئی خلش باقی نہ رہ جائے، تو اس بات کو اختیار کر لینا چاہیے اور پھر اس امر کی ذرا بھی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ کوئی چیز اس کے خلاف ہے۔

اس طریقہ فکر ونظر کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ اس سے آدمی کو جو کچھ ملتا ہے، یہ اس کی اپنی تحقیق وکاوش کا ثمرہ ہوتا ہے اور آدمی کی یہ ایک نفسیاتی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی کمائی کو بہت عزیز رکھتا ہے، اس کی محبت اس کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہوجاتی ہے اور اسکی حفاظت کی راہ میں وہ کسی چیز سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ گویا اصلی ایمانی کیفیت، جو قرآن کی اصلی منزل مقصود ہے، اسی طریقہ فکر ونظر سے ملتی ہے، پھر اس سے طالب کے زاویہ نگاہ میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے، وہ ٹھوکریں کھا کر اور سختیاں جھیل کر فکر و تدبر کے میدان کا آزمودہ کار سپاہی بن جاتا ہے اور تحقیق وکاوش کے مورچوں میں کبھی بددل اور پست ہمت نہیں ہوتا۔ وہ گھسنے کی تمام راہوں اور نکلنے کے تمام راستوں کا ماہر ہوجاتا ہے۔ اس کی ایک راہ بند کرو، دوسری راہ کھول لے گا۔ اگر ایک دروازہ نہیں کھلے گا، دوسرے دروازہ پر دستک دے گا۔ اس طرح درجہ بدرجہ وہ اپنی منزلیں طے کرتا ہوا اس مقام تک پہنچ جائے گا جو حکمت اور معارف نبوت کی اصلی جلوہ گاہ ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی معلومات دوسروں کی معلومات سے بالکل مختلف ہوں گی۔ دوسرے جس چیز کو معبود بنا کر پوج رہے ہوں گے وہ اس کو بال مگس کے برابر بھی وقعت نہ دے گا اور دوسرے جس شے کو حقیر سمجھ کر ٹھکرا دیں گے وہ اس کو حرز جاں بنا کر گرہ کرے گا۔ یہ اس لئے کہ دوسروں کے پاس کوئی تجربہ نہیں ہے لیکن اس کے پاس بے شمار تجربات کی رہنمائی ہے۔ وہ اس سمندر کے عجائب سے واقف ہے، دوسرے اس منزل کی رسم وراہ سے واقف نہیں ہیں۔

## عرب جاہلیت کی تاریخ:

قرآن مجید کے تدبر میں عہد نزول قرآن اور قدیم عرب اور ان سے متعلق اقوام کی تاریخ سے واقفیت بھی ایک ضروری عنصر ہے۔ قرآن کی بے شمار آیتیں عرب کی قدیم تاریخ اور اس سے متعلق اقوام اور جماعتوں کے احوال وایام کی طرف اشارے کرتی ہیں اور یہ اشارات بالعموم اس قدر مجمل اور مبہم ہیں کہ انکا صحیح تصور ذہن میں قائم ہونا اس وقت تک

مشکل ہوتا ہے جب تک ان قوموں کی تاریخ سے واقفیت نہ ہو۔ بلاشبہ جہاں تک قرآن مجید کی تعلیمات کے سمجھنے کا تعلق ہے یہ ابہام و اجمال مانع نہیں ہوتا ہے لیکن ان اشارات کے صحیح تصور سے کلام کی تاثیر میں ایسا اہم اضافہ ہو جاتا ہے کہ اس سے اغماض نہیں برتا جا سکتا بلکہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کی جن سورتوں کو سن کر عہد نزول قرآن میں ایک عرب بے خود ہو جاتا ہو ہمارے لئے وہ محض اس وجہ سے بالکل بے اثر ہو کر رہ جائیں کہ ان کے اندر جو اشارات ہیں ہم انکے صحیح تصور سے محروم ہیں۔

پھر قرآن مجید کے نزول پر پوری ۱۴ صدیاں گزر چکی ہیں اور ہم کو اسے موجودہ دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ قرآن کے عہد نزول میں جو واقعات اور احوال ہر شخص کے جانے بوجھے ہوئے تھے۔ موجودہ دنیا کے لئے نا معلوم ہیں اور علم و تحقیق کی ترقیوں نے آج کسی امر کے رد و قبول کا معیار اس قدر بلند کر دیا ہے کہ جب تک اس عہد کی پوری دنیا اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ لوگوں کے سامنے نہ رکھ دی جائے، لوگ اسکو کوئی وزن ہی نہیں دیں گے۔

علاوہ ازیں اس عہد کی تاریخ کی بے شمار چیزیں ہمکو اس لئے بھی معلوم ہونی چاہئیں کہ ان کے جانے بغیر قرآن مجید کی تعلیمات کا اصلی وزن نہیں معلوم ہو سکتا۔ مثلاً اس عہد کی تمدنی حالت، اس عہد کے سیاسی رجحانات، اس زمانہ کے مذہبی عقائد و تصورات اور اخلاقی معیارات وغیرہ، نیز زمانہ نزول قرآن میں مختلف قوموں کے باہمی تعلقات کی نوعیت، انکے دستور و مراسم کی کیفیات، ان کے اصنام کی خصوصیات اور تمدن و سیاست پر انکے اثرات وغیرہ۔

قرآن مجید پر غور کرنے والوں کو، اگر انکا فکر و نظر صحیح نہج پر ہے، ان امور کے متعلق طرح طرح کے شبہے پیدا ہوتے ہیں اور یہ نہایت بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک تفسیر بھی ایسی نہیں ہے جو ان چیزوں کے متعلق ہماری کوئی رہنمائی کر سکے۔ عرب کی تاریخ سے متعلق ہمارے پاس جو معلومات ہیں وہ نہایت مسخ شدہ ہیں۔ قرآن کے تدبر میں ان سے کوئی مدد

مانگنا تو درکنار الٹے ان سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔اس وجہ سے اس معاملہ میں بھی صحیح مسلک یہی ہے کہ اصل معتمد قرآن مجید ہی کو بنایا جائے اور تاریخوں کی پیش کردہ معلومات پر قرآن کی روشنی میں غور کرکے انکے صرف اتنے ہی حصہ کو اختیار کیا جائے جتنا قرآن مجید سے موافق پڑتا ہے۔اس معاملہ میں استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق فکر ونظر کا اندازہ کرنے کے لئے سورہ فیل کی تفسیر پڑھنی چاہیے،اس سے معلوم ہوگا کہ ان کا اصلی اعتماد قرآن مجید کے اشارات اور کلام عرب پر ہوتا ہے اور تاریخ کی روایات کو وہ ہمیشہ انہی دونوں کسوٹیوں پر پرکھ کر قبول کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اس باب میں ان دو چیزوں کے سوا کسی تیسری چیز سے مشکل ہی سے مدد ملتی ہے۔

## کلام عرب، نحو اور فن بلاغت:

قرآن مجید کی زبان اور اسکے اسالیب کی مشکلات حل کرنے میں تین طرح کی چیزیں مدد دے سکتی ہیں۔

۱۔ کتب لغت اور کلام عرب

۲۔ کتب نحو

۳۔ کتب بلاغت

لغت کی کتابوں میں لسان العرب سب سے زیادہ مدد دے سکتا ہے یہ سب سے زیادہ جامع لغت ہے۔اہل لغت کا تمام قیل وقال اس میں یکجا مل جاتا ہے لیکن قرآن مجید کے الفاظ کے بارہ میں عموماً اس کا طریقہ یہ ہے کہ ارباب تاویل کے اقوال نقل کردیتا ہے۔یہ چیز نہایت غلط ہے۔اس سے بچنے کی ضرورت ہے ورنہ لغت دیکھنے کا اصلی فائدہ ہی فوت ہوجاتا ہے۔

بعض لوگ مفردات امام راغب کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔اس اعتبار سے تو یہ قابل

قدر ہے کہ خالص قرآن کا لغت ہے لیکن حل مشکلات کے پہلو سے اس کا کوئی وزن نہیں ہے۔ صرف مبتدیوں کو اس سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کا طریقہ اگرچہ صحیح ہے لیکن نہ تو اس میں سارے الفاظ ہی ملتے ہیں نہ کلام عرب سے اس میں شہادتیں ہی پیش کی گئی ہیں اس وجہ سے یہ کچھ زیادہ مفید چیز نہیں ہے۔

اصلی چیزیں جن کی ایک طالب قرآن کو ضرورت پڑتی ہے، یہ ہیں کہ ایک لفظ کے صحیح حدود واطراف کیا ہیں۔ یہ خالص عربی ہے یا مولد، پھر اس کے اصلی معنی کیا ہیں اور اسکے معنی میں سے کن پر اس کا اطلاق حقیقتا ہے اور کن پر بطریق مجاز ،لیکن یہ باتیں لغتوں سے مشکل ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس پہلو سے کوئی لغت بھی کار آمد نہیں ہے، کہیں کہیں صحاح جوہری میں بعض چیزوں کی جھلک نظر آجاتی ہے، مگر بہت کم۔

قابل اعتماد چیز اس باب میں دراصل کلام عرب ہی ہے۔ لفظ کے اصلی حقائق اسی سے کھلتے ہیں پھر اسالیب کلام کا معاملہ تو سرتاسر اسی سے متعلق ہے، لغت سے اسالیب کلام کے بارہ میں کوئی رہبری نہیں ہوتی۔ لیکن کلام عرب میں بھی اصلی اور نقلی دونوں ہیں۔ آدمی کو ایک عرصہ کی مشق کے بعد۔ اگر ذوق اچھا ہو۔ اصلی ونقلی کے مابین امتیاز ہوتا ہے اور یہ امتیاز نہایت ضروری ہے، ورنہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بالکل شاذ اور غیر معروف معنی کو اختیار کر لیتا ہے اور معروف معنی کو چھوڑ دیتا ہے، مثلاً بعض لوگوں نے صرف اصلی اور نقلی میں امتیاز نہ کر سکنے ہی کی وجہ سے ''تمنی'' کے معنی میں تلاوت کرنے کے یا ''نحر'' کے معنی سینہ پر ہاتھ باندھنے کے لے لئے۔ اس کی مثال تفسیروں میں بہت ملتی ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا تمام تر اعتماد کلام عرب پر تھا۔ وہ جس لفظ یا جس اسلوب کے بارہ میں متردد ہوتے اس کو صرف قرآن مجید اور کلام عرب میں ڈھونڈھتے۔ بعض الفاظ واسالیب کی تلاش میں انہوں نے مدتیں صرف کر دیں۔ ان کی کتب، اسالیب القرآن اور مفردات، میں اس سلسلہ کے تمام معرکے ملیں گے ''غشاء

اَحوی (۱)' میں لفظ 'غثاء' کے بارہ میں مولانا خود فرماتے تھے کہ میں نے اس کے صحیح مفہوم کی تحقیق میں برسوں صرف کر دئے۔ اس لفظ کے بارہ میں ان کو تمام اہل لغت اور ارباب تفسیر سے اختلاف تھا۔ چنانچہ ایک مدت تک وہ اس کی تحقیق میں کلام عرب کا ذخیرہ چھانتے رہے اور فرماتے تھے کہ جس روز میری تحقیق مکمل ہوئی ہے مجھے وہ خوشی حاصل ہوئی ہے جو بادشاہوں کو ملکوں کو تسخیر میں بھی نہیں ہوتی ہوگی۔

کتب نحو کا معاملہ کتب لغت سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ یہ لوگ قرآن کی نحوی مشکلات کو بالعموم عام ضابطہ سے الگ شواذ کے سلسلہ میں ذکر کرتے ہیں حالانکہ قرآن عرب کے سب سے زیادہ معروف اسلوب پر اترا ہے۔ ارباب تفسیر میں سے زمخشریؒ کے سوا کسی نے قرآن کی نحوی مشکلات سے زیادہ بحث نہیں کی ہے اور یہ کام تنہا ایک شخص کے بس کا نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں قرآن مجید کی نحوی مشکلات حل کرنے کے لئے ہم کوئی قیمتی رہنمائی نہیں رکھتے اور چونکہ اپنے اندر مزید کشف و تحقیق کی ہمت بھی نہیں پاتے، اس لئے مجبور ہیں کہ ارباب نحو نے جو اصول بیان کر دئے ہیں انہی پر اعتماد کریں اور کسی نہ کسی طرح قرآن مجید کو انہی کے مطابق ثابت کر دکھائیں۔ حالانکہ اس کی وجہ سے تاویل کی بے شمار لاینحل مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ قرآن کے طلبہ کو چاہیے کہ نحوی مشکلات میں کلام عرب پر اعتماد کریں تا کہ ایک طرف صحیح تاویل کی راہ کھلے اور دوسری طرف دنیا پر یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ درحقیقت قرآن ہی کا اسلوب اعلیٰ اور معروف اسلوب ہے۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی کے مطبوعہ رسائل میں انکے طریق تحقیق کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور آئندہ انکی دوسری تصنیفات میں بھی، جو شائع ہوں گی ان کی کاوشیں ملیں گی۔ ان کی رہنمائی سے اس سلسلہ میں بہت کچھ خدمات انجام دی جا سکتی ہیں۔

فن بلاغت کی نارسائیوں کا حال سب سے زیادہ یاس انگیز ہے ہمارے ارباب

---

(۱) الأعلیٰ: ۵- دیکھیں مفردات القرآن ''غثاء'' ص ۸۵ اور ''احوی'' ص ۲۱

بلاغت کا تمام تر ماخذ شعراء کا کلام ہے اور شعر کی تنگ دامانیوں کا حال معلوم ہے کہ وہ بلاغت کلام کی نہایت ابتدائی اور سطحی باتوں ہی کے لئے ماخذ کا کام دے سکتا ہے اس لئے ان کی تمام جولانیاں دروبست کی نزاکتوں، الفاظ کے حسن وقبح اور بدیع کی گل کاریوں تک محدود ہیں ۔رہیں یہ باتیں کہ حسن استدلال کے کیا کیا پہلو ہیں، ربط معنی کی کیا کیا ادائیں ہیں، امثال وقصص سے عبرت پذیری کے کیا کیا ڈھنگ ہیں ،کلام کس کس طرح چلتا ہے، کس کس طرح اپنے مرکز وعمود کی طرف مڑتا ہے، تہدید وزجر کے کیا کیا اسلوب ہیں، متکلم اپنی شدت یقین کو کس طرح ظاہر کرتا ہے، شریفانہ اعراض کے کیا کیا ڈھب اختیار کرتا ہے، ایک شفیق معلم کن کن شکلوں میں حسرت کرتا ہے، عتاب میں محبت کی جاں نوازیاں کس طرح ہوتی ہیں، خطاب کے عجائب تصرفات کا کیا عالم ہے، ان تمام مباحث سے ہمارا تمام دفتر بلاغت بالکل خالی ہے۔ یہ چیزیں یا تو خطبائے عرب کے کلام میں مل سکتی تھیں یا قرآن مجید میں مل سکتی ہیں، خطباء کا کلام لوگوں کو ملا نہیں اور قرآن کو لوگوں نے ماخذ نہیں بنایا۔ اس سلسلہ میں باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش قابل قدر ہے، لیکن وہ بھی مجبور ہوئے کہ اصولوں کے استنباط کے لئے شعروں ہی کو ماخذ قرار دیں۔ خطباء کے کلام کی طرف اول تو وہ پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے اور ہوئے بھی تو محض اس قدر کہ ان کے کچھ سرسری نمونے پیش کر کے گزر گئے۔ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی تصنیفات میں بہت سے جواہر ریزے ملتے ہیں لیکن کاوش اور تلاش کی ضرورت ہے۔ استاذ امام کی جمہرۃ البلاغۃ اس سلسلہ کی آخری اور سب سے زیادہ اہم چیز ہے، انہوں نے اس فن کی ترتیب ہی بدل دی ہے اور نئے اصول دریافت کئے ہیں جو بلاغت قرآن کے جانچنے کے لئے صحیح معیار قرار پا سکتے ہیں۔

## قرآن اور کتاب مقدس:

قرآن کے طالب علم کو کتب سابقہ پر بھی نظر رکھنی چاہیے، جہاں تک احکام شریعت اور حقایق دین کے ماننے کا تعلق ہے ہم کتب سابقہ کے محتاج نہیں ہیں، آفتاب کی تابانی کے

بعد ستاروں کی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کے بعد ان تحریف شدہ کتابوں سے اعراض کیا لیکن بعض ضروری چیزیں ایسی ہیں جن کے لئے کتب سابقہ کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

یہ معلوم ہے کہ قرآن مجید آسمانی کتابوں میں سے ایک ہے اور ہمارے پیغمبر ﷺ سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی ہیں۔ پس سابقہ کتابوں کے مطالعہ سے ہم کو طرح طرح کے فائدے ہوں گے۔ اس سے ہم پر قرآن مجید کی حقیقی عظمت آشکارا ہوگی، قرآن کی بہت سی تلمیحات بے نقاب ہوں گی۔ اہل کتاب کو قائل کرنے کے دلائل ہاتھ آئیں گے۔ یہ آخری چیز اس زمانہ میں نہایت اہم ہوگئی ہے۔ اہل کتاب کو قرآن کے بعض حوالوں پر طرح طرح کے اعتراضات ہیں اور ان کا مسکت جواب اسی وقت ممکن ہے جب توریت وانجیل اور ان سے متعلق تمام لٹریچر پر آدمی کی نظر ناقدانہ ہو۔

قرآن مجید کی ان تلمیحات واشارات کا معاملہ بھی نہایت اہم ہے جو اہل کتاب سے متعلق ہیں۔ قرآن مجید پر ابتدائی ایمان لانے والے یا تو اہل کتاب تھے جو اپنے گھر کی باتوں سے اچھی طرح واقف تھے یا مسلمان تھے جو اہل کتاب سے میل جول رکھنے کی وجہ سے انکے خیالات وعقائد اور ان کی روایات سے باخبر تھے۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے اہل کتاب کے عقائد، ان کے مزعومات، انکی تحریفات اور ان کے تاریخی واقعات وغیرہ کی طرف اس قدر اجمالی اشارات کئے ہیں کہ انکا صحیح تصور قائم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور آج اسی صورت میں ممکن ہے جب اہل کتاب کے صحیفوں اور ان کے مذہبی لٹریچر پر پوری نظر ہو۔

پھر قرآن مجید نے بعض مقامات میں ان کی کتابوں کا اس طرح حوالہ دیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآن مجید یہ چاہتا ہے کہ ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے، مثلاً فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ | اور ہم نے زبور میں موعظت کے بعد لکھ دیا |
| اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ. | ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے |

(۱) ہی ہوں گے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُولٰی | یہی تعلیم اگلے صحیفوں میں بھی ہے، موسیٰ اور |
| صُحُفِ اِبْرَاھِیْمَ وَ مُوْسٰی. | ابراہیم کے صحیفوں میں۔ |
| (۲) | |

تاریخی احوال وواقعات کی طرف اشارہ کرنے کا یہ اسلوب ہے:

| | |
|---|---|
| وَقَضَیْنَا اِلٰی بَنِی اِسْرَائِیلَ فِی الْکِتٰبِ | اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ |
| لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ. | سے کتاب میں آگاہ کردیا تھا کہ تم دو مرتبہ |
| (۳) | زمین میں فساد مچاؤ گے۔ |

غرض کتب سابقہ کا مطالعہ اگر پوری تحقیق وتنقید سے کیا جائے تو قرآن مجید کا طالبعلم اس سے طرح طرح کے فائدے حاصل کرسکتا ہے۔

لیکن ان کتابوں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے کسوٹی قرآن مجید ہی کو قرار دیا ہے جہاں ان کتابوں میں اور قرآن میں اختلاف ہوگا وہاں ہم قرآن کو اختیار کریں گے اور ان کتابوں کو چھوڑ دیں گے۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ ان کتابوں سے جس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں اور پھر جس طرح انکی غلطیاں اور قرآن مجید کی حقانیت واضح کرتے ہیں اس کی مثالیں یوں تو ان کی تمام تصنیفات میں مل سکتی ہیں لیکن بالخصوص 'رسالہ ذبیح' (۴) میں ان کا زور دیکھنا چاہیے۔ سلف میں سے علامہ ابن تیمیہؒ کی واقفیت اہل کتاب

---

(۱) الانبیاء :۱۰۵

(۲) الاعلیٰ :۱۸-۱۹

(۳) الاسراء :۴

(۴) کتاب مذکور کے عربی اور اردو دونوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور دستیاب ہیں۔ عربی ایڈیشن دائرہ حمیدیہ اعظم گڈھ اور دارالقلم دمشق سے جبکہ اردو ایڈیشن دائرہ حمیدیہ اور فاران فاؤنڈیشن (پاکستان) سے۔

کے متعلق براہ راست معلوم ہوتی ہے۔

یہ چند ضروری چیزیں جو طلبۂ قرآن کے لئے نافع ہیں ہم نے بیان کر دی ہیں۔ مگر یہ خارجی وسائل وذرائع جو بیان ہوئے ہیں یہ سب ثانوی چیزیں ہیں، اصلی چیزیں وہی ہیں جو مضمون کی ابتدا میں بیان کی گئی ہیں ان کے بغیر آدمی کے لئے یہ تمام وسائل وذرائع یک قلم بیکار ہیں۔ ہاں اگر ان تمام امور کے ساتھ ان چیزوں کا بھی پورا اہتمام ہو تو ہم کو یقین ہے کہ طالب کی راہ بہت آسان ہو جائے گی اور یہ زیادہ سے زیادہ کامیابی ہے جو اس راہ میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان وادیوں کے قطع کر لینے کے بعد سے کسی شخص کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ پورا قرآن سمجھ لے گا۔ اس معاملہ کا تمام تر انحصار صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق و ہدایت پر ہے۔ وہی راہیں کھولتا ہے اور وہی مشکلوں میں رہنمائی کی روشنی دکھاتا ہے۔ پس طالب قرآن کا دل ہمیشہ اسی کے سامنے جھکا رہنا چاہیے جو کچھ مل جائے اس کے لئے شکر گذار ہو اور جو نہ ملے اس کے لئے امیدوار رہے نہ تو فخر کرے، نہ کبھی مایوس ہو اور تجارت اور حصول شہرت کا ذریعہ تو قرآن مجید کو ہرگز نہ بنائے۔ آج جو لوگ ان راہوں سے گذرے بغیر تحقیق واجتہاد کے مقامات عالیہ تک پہنچ گئے ہیں وہ نہ تو قرآن مجید کی صحیح خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اور نہ مسلمانوں کی کوئی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے فتنوں سے قرآن کو بھی محفوظ رکھے اور مسلمانوں کو بھی امان میں رکھے۔

باب ۳

# تیسیر قرآن

قرآن مجید کی تعریف میں خود قرآن میں جگہ جگہ وارد ہے کہ "وہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے"[۱] "اس کو اللہ تعالیٰ نے نہایت آسان بنایا ہے"[۲] "اس میں کوئی اینچ پیچ اور الجھاؤ نہیں ہے"[۳] اور وہ ہر بات کو کھول کر بیان کرنے والی کتاب ہے۔[۴]

قرآن کے مذکورہ بالا اوصاف کی بناپر، جو اس نے خود بیان کئے ہیں یہ کہا جاتا ہے کہ:

۱۔خدا نے قرآن میں جو بات بیان کی ہے کھول کر بیان کی ہے، اس میں کوئی چیز گنجلک نہیں ہے۔

۲۔قرآن مجید بذات خود دنیا کے ہر طبقہ کے لئے ہدایت ہے، وہ محتاج تفسیر و تاویل نہیں ہے۔

۳۔اس کا انداز بیان اس قدر واضح اور شگفتہ ہے کہ وہ مخاطب کو فہم مطالب میں اپنے سوا کسی اور چیز کا محتاج نہیں بناتا۔

۴۔صرف عربی زبان دانی قرآن دانی کے لئے بس ہے۔

۵۔قرآن کو نہ نبی کے تشریحی بیانات کی حاجت ہے، نہ شان نزول کی۔لغت عرب کے سوا قرآن کے معنی سمجھنے میں کسی خارجی چیز سے مدد لینا قرآن کو معنوی تحریف کے غار

(۱) ھدی للناس، البقرۃ: ۱۸۵ (۲) ولقد یسرنا القرآن للذکر، القمر: ۱۷

(۳) قرآنا عربیا غیر ذی عوج، الزمر: ۲۸ (۴) تبیانا لکل شئی، النحل: ۸۹

میں دھکیلنا ہے اور اس کی قطعیت کو برباد کر کے اس کو مظنون و موہوم بنانا ہے۔

ان تمام دعاوی کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ قرآن مجید اپنی تعلیمات، اپنی زبان، اپنے انداز بیان، غرض ہر پہلو سے بالکل واضح ہے اس وجہ سے اس کا مخاطب، اس کو سمجھنے کے لئے عربی زبان کے علم کے سوا کسی خارجی اعانت کا محتاج نہیں ہے۔

اس دعوی کی تائید میں عموماً جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ قرآن مجید بنی نوع آدم کے تمام طبقات کے لئے صحیفہ ہدایت بن کر نازل ہوا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ جو اس پر ایمان لائے گا فلاح پائے گا اور جو اس سے اعراض کرے گا وہ ہلاک ہوگا۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کی تعلیم و دعوت کا معیار عام عقل انسانی کے معیار کے مطابق ہوتا کہ ہر انسان جو فکر و نظر کی عام استعداد رکھتا ہے اس کو سمجھ سکے اور اس کی تعلیمات پر عمل کر کے خالق کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کر سکے۔ ایک ایسی کتاب جس کا مقصد عام تعلیم و دعوت ہو نہ تو لفظاً اتنی مجمل اور پیچیدہ ہونی چاہیے کہ جب تک خواص اس کی مشکلات حل نہ کریں وہ سمجھ میں نہ آئے اور نہ معناً اتنی مبہم اور دقیق ہونی چاہیے کہ انسانی فہم و ادراک کی عام استعداد اس کے اسرار و رموز سمجھنے سے قاصر رہ جائے۔

۲۔ قرآن مجید سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ قطعی مانی جاتی ہے اس وجہ سے اس کی تفسیر و تاویل ایسی چیزوں کی اعانت سے مستغنی ہونی چاہیے جنکا بیشتر حصہ ظنی ہے مثلاً روایات و احادیث وغیرہ، ورنہ قرآن مجید کی قطعیت برباد ہو جائے گی۔

۳۔ قرآن مجید نے خود جا بجا اپنی تعریف ایسے لفظوں میں کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی عبارت نہایت آسان، اس کا طرز بیان نہایت شگفتہ، اس کا طریق استدلال بالکل واضح ہے، اس لئے اس کے سمجھنے میں ایک عجمی کے لئے عربی زبان کے علم کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں، مثلاً سورہ قمر میں ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (۱) (ہم نے قرآن کو ذکر کیلئے آسان بنا دیا ہے پس ہے کوئی یاد دہانی حاصل کرنے

(۱) القمر ۵۴:۱۷

والا؟) سورہ زمر میں ہے قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ. (۱) (ایک عربی قرآن جس کے اندر کوئی کجی نہیں تا کہ وہ عذاب سے بچیں۔)

ان دلیلوں میں بہت سی غلط فہیاں پوشیدہ ہیں جن کو آگے چل کر ہم بے نقاب کریں گے لیکن ایک حقیقت کا ہم کو بے تکلف، پہلے ہی قدم پر اعتراف کر لینا چاہیے کہ یہ جو کچھ آج کہا جا رہا ہے یہ کسی عارضی غلط فہمی یا کسی ہنگامی غلط روی کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید کی تفسیر و تاویل کا جو طریقہ، ایک عرصہ سے، مسلمانوں میں رائج و مقبول رہا ہے اس کا لازمی نتیجہ ہی یہی تھا کہ ایک زمانہ آئے جس میں اس طریقہ کے متعلق لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں اور شکوک پیدا ہوں اور کتاب الٰہی کے متعلق آزادی و مطلق العنانی کا ایک ایسا فتنہ اٹھ کھڑا ہو جو پچھلے تمام فتنوں سے شدید تر اور ہلاکت انگیز ہو۔

اس اجمال کو کسی قدر تفصیل کیساتھ سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ پہلے ایک نظر تفسیر قرآن مجید کے مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات پر ڈال لی جائے۔

## تفسیر کے مختلف دور اور ان کی خصوصیات:

یہ حقیقت بلا اختلاف مسلم ہے کہ تفسیر قرآن کا سب سے زیادہ مبارک دور ہماری تاریخ کا ابتدائی دور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے تعلیم و تعلم کے تمام ضروری شرائط و حالات، اس عہد مبارک میں، بدرجہ کمال موجود تھے۔ پھر دور نبوت کے بعد اسلامی تعلیمات کے زوال، عجمیت اور عجمی علوم کے اختلاط، مذاق زبان کے بگاڑ نے بدعتوں کا فتنہ اٹھایا اور چونکہ دین کی اصلی بنیاد قرآن مجید تھا اس وجہ سے قدرتی طور پر، اہل بدعت کے تیشے سب سے پہلے اسی پر پڑے۔ اس فتنہ کے سدباب کے لئے اہل سنت اور اہل حق نے یہ

(۱) الزمر: ۲۸

مذہب اختیار کیا کہ تفسیر قرآن کے باب میں تمام قیل وقال سے علیحدہ ہو کر حتی الامکان صرف رسول اللہ ﷺ اور صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کے اقوال وآثار پر اعتماد کیا جائے تاکہ اصحاب بدعت کو کتاب الٰہی میں دراندازی کا کوئی راستہ نہ ملے۔

یہ حقیقت میں ایک فتنہ کے سد باب کے لئے ایک وقتی تدبیر اور ایک بیماری کی مناسب وقت دوا تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ جو جماعت اپنی بدعات کی حمایت وتائید میں قرآن کو ساتھ لینا چاہتی ہے اس کیلئے یہ راہ مسدود ہو جائے۔

اس اصول تفسیر کی جو سب سے زیادہ جامع اور عظیم الشان کتاب تالیف ہوئی وہ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔اس میں وہ سب کچھ یکجا جمع ہے جو سلف سے بطریق روایت منقول ہے۔ان کا طریقہ یہ ہے کہ ہر آیت کے تحت سلف کے تمام اقوال بغیر کسی جرح ونقل کے جمع کر دیتے ہیں اور جو قول ان کے نزدیک ترجیح کے قابل ہوتا ہے، اخیر میں اس کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔حتی الامکان اس قول کو ترجیح دیتے ہیں جو دوسرے تمام اقوال کو اپنے اندر جمع کر لے، جابجا لغت ونحو سے بھی استدلال کرتے ہیں لیکن نہ تو اس میں روایات کی تنقید ہے نہ قرآن پر، قرآن یا تاریخ یا عقل وغیرہ کے پہلو سے کوئی بحث کی گئی ہے، اس سبب سے اس میں جو جواہر ریزے ہیں وہ منکر اور ضعیف روایات کے انبار میں گم ہیں اور جب تک خود قرآن یا عقل کی روشنی رہنمائی نہ کرے ان کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ان وجوہ کی بنا پر اس عظیم الشان تصنیف سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی پوری تنقید کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے۔

مولف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس کتاب میں صرف روایات کو جمع کر دینے کی خدمت انجام دی ہے، نقد ونظر کا کام اہل نظر کیلئے چھوڑ دیا ہے۔اگر یہ خدمت بھی وہ اپنے سر لے لیتے تو شاید روایات وآثار کا ایسا عظیم الشان ذخیرہ ہم کو ہاتھ نہ آ سکتا۔ابھی حال ہی میں ان کے حالات میں کہیں پڑھ کر تعجب ہوا کہ ان کے ذخار قلم نے جو سرمایہ فراہم کر دیا ہے، اگر

ان کی تصنیفی عمر کو سامنے رکھ کر، اس کا حساب لگایا جائے تو روزآنہ چالیس صفحہ کا اوسط پڑیگا، ایک ایسا سبک عنان قلم اگر جمع و تالیف کے ساتھ ساتھ نقد و نظر کے الجھاؤ میں بھی پھنس جاتا تو یقیناً سلف کے اقوال کے ایک بڑے حصہ سے ہم محروم ہو جاتے۔

اس کے بعد سب سے زیادہ مشہور و مقبول تفسیر علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی ہے لیکن یہ حقیقت میں تفسیر ابن جریر کا خلاصہ ہے۔ صرف اتنی بات اس میں نئی ہے کہ محدثانہ طریق پر اس میں روایات کی تنقید کی گئی ہے اس کے سوا قرآن مجید کے فہم و تدبر کے دوسرے اصولوں سے اس میں بھی کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ صرف اس قدر تبدیلی کچھ زیادہ مفید مقصد نہیں ہے۔

تفسیر کی تیسری اہم کتاب امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر متکلمانہ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس اعتبار سے یہ لاجواب کتاب ہے۔ لیکن یہ کلامی بحثیں اس پر اس قدر حاوی ہو گئی ہیں اور اشعریت کی حمایت کے لئے امام صاحب نے اس میں قرآن مجید کو اس بے دردی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ فہم قرآن کے لئے یہ کتاب نہ صرف یہ کہ کچھ مفید نہیں رہ گئی ہے بلکہ نہایت مضر بن گئی ہے ۔ البتہ اگر کوئی شخص متکلمانہ قیل و قال اور اشعریت و اعتزال کے معرکوں سے دلچسپی رکھتا ہو یا یہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ متکلمین نے قرآن کو کس طرح سمجھا ہے تو اس کے لئے یہ بہترین کتاب ہے۔

تفسیر کی چوتھی اہم کتاب علامہ زمخشریؒ کی تفسیر کشاف ہے، اس کا طریقہ مذکورہ کتابوں سے بالکل الگ ہے۔ علامہ زمخشری کی نظر کا محور عموماً عبارت قرآن ہوتی ہے۔ یہ پہلے لغت، اعراب اور ربط کلام سے بحث کرتے ہیں، پھر احتیاط کے ساتھ روایات بھی لاتے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت نہایت قابل قدر ہے کہ وہ لغت و اعراب میں عموماً صحیح مذہب اختیار کرتے ہیں۔ اس چیز میں امام رازیؒ بھی ان کا لوہا مانتے ہیں۔ یہاں تک کہ باوجود انکے ساتھ حریفانہ کاوش کے، ان کی لغوی و نحوی تحقیقات کو امام رازیؒ اکثر اپنی کتاب

میں بلاتکلف بغیر کسی تغیر وتصرف کے نقل کر دیتے ہیں ان اعتبارات سے یہ کتاب قرآن مجید کے طالب علموں کے لئے مفید ہے، لیکن امام رازیؒ جس طرح اشعریت کے علمبردار ہیں اسی طرح علامہ زمخشری مذہب اعتزال کے وکیل ہیں۔اور کتاب الٰہی کیساتھ سب سے بڑی ناانصافی یہی ہے کہ اس کے پیچھے چلنے کے بجائے آدمی اس بات کی کوشش کرے کہ اس کو خود اپنے کسی فکر وخیال کے پیچھے چلائے۔

تفسیر کی مرکزی کتابیں یہی ہیں جو عام طور پر اہل علم کے پیش نظر رہتی ہیں۔ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں وہ درحقیقت انہی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔بعض تفسیریں تصوف کے رنگ میں بھی لکھی گئی ہیں لیکن ان کے نہج استدلال اور طریق بحث ونظر میں ایک مخصوص ذوقی رنگ غالب ہے۔جس کو وہ لوگ نہیں قبول کر سکتے جو قرآن مجید کو روایات یا الفاظ ولغات کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں۔اس قسم کی تفسیریں ہماری نظر سے کم گزری ہیں۔ (۱) اس لئے ہم ان کی نسبت کوئی سنجیدہ رائے نہیں دے سکتے لیکن عام مطالعہ میں بعض اکابر صوفیہ کے جو اقوال نظر سے گزرے ہیں ان سے نہایت مایوسی ہوئی ہے۔مثلاً ایک بزرگ، جو سرخیل حلقہ تصوف ہیں،

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡ سَوَاءٌ عَلَیۡھِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَھُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡھُمۡ لَا یُوۡمِنُوۡنَ. خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِھِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِھِمۡ وَعَلٰی اَبۡصَارِھِمۡ غِشَاوَۃٌ (۲) | جن لوگوں نے کفر کیا،ان کے لئے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اوران کے کانوں پر مہر لگادی ہے،اوران آنکھوں پر پردہ ہے۔ |

(۱) استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی امام قشیریؒ کی تفسیر کا کبھی کبھی اچھے الفاظ میں ذکر فرمایا کرتے تھے۔میں نے حیدرآباد (دکن) میں اس کو کہیں کہیں سے دیکھا لیکن کوئی خاص بات نہیں نظر آئی۔ممکن ہے کہ اس کا زیادہ حصہ پڑھنے کا موقع ملتا تو اس کا وہ پہلو معلوم ہوسکتا جس پہلو سے مولانا اس کا ذکر خیر کرتے تھے۔

(۲) البقرۃ: ۶-۷

کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جنہوں نے اللہ کا ایمان اپنے دلوں میں چھپالیا، سوڈراؤنہ ڈراؤ وہ ایمان نہ لائیں گے کیونکہ وہ میرے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان بھر کر ان پر مہر لگادی ہے۔ اب اس میں کسی اور کی سمائی باقی نہیں رہی ہے۔ (۱)

ممکن ہے یہ اقوال غلط منسوب کر دئے گئے ہوں اور خدا کرے ایسا ہی ہو لیکن یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ تفسیر سے متعلق اہل تصوف کے جو اقوال عموماً کتابوں میں ملتے ہیں ان پر ذوقی رنگ غالب ہے، بلکہ ایک حد تک ان میں باطنیت کی بو پائی جاتی ہے جس کے لئے لغت و زبان سے انحراف لازمی ہے۔ جن لوگوں نے اس رنگ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے وہ ہماری اس رائے سے شائد اختلاف نہ کرسکیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہے کہ دور اول کے بعد تفسیر قرآن کی راہ میں جو پہلا قدم اٹھایا گیا وہی غلط تھا، اس کا محرک اگرچہ ایک اچھا خیال تھا لیکن افسوس ہے کہ اس کے نتائج خاطر خواہ نہیں نکلے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک فتنہ کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی گئی اور ساتھ ہی ایک دوسرے فتنہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اہل بدعت اور اصحاب باطل کی مطلق العنانیوں اور فتنہ آرائیوں سے بچنے کیلئے روایات و آثار کو اہمیت دی گئی لیکن پھر روایات میں اس درجہ انہماک بڑھ گیا کہ ان کے بارہ میں نقد و تمیز کی آنکھیں بند ہوگئیں اور آہستہ آہستہ صحیح روایات کے ساتھ قصوں اور اسرائیلیات کا ایک بڑا حصہ بھی تفسیر کی کتابوں میں داخل کر دیا گیا۔

جرح و نقد سے بے پروائی کا ایک افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ ہر آیت کے متعلق صحیح اور غلط اقوال کا ایک ایسا انبار جمع ہوگیا کہ کسی آیت کی صحیح تاویل معلوم کرنا نہایت مشکل ہوگیا اور لوگ بجائے اس کے کہ صحیح اور غلط میں امتیاز کر کے اس مشکل کو آسان کرنے کی کوشش کرتے وہ ہر آیت کے بارہ میں بہت سے اقوال کو نقل کر دینا ہی کمال قرآن سمجھنے لگے۔

(۱) "فتوحات" مکیہ ۱/۱۱۵

حالانکہ یہ موٹی سی بات ہر عقل سمجھ سکتی ہے کہ ایک آیت کے متعلق صحیح بات صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن اولاً تو روایات کی تنقید کا کام کوئی سہل کام نہیں تھا، ثانیاً صحیح روایات سے جو اقوال ثابت ہوں ان میں سیاق وسباق اور الفاظ و نظم کی مدد سے کسی ایک قول کو ترجیح دینا اس سے بھی زیادہ مشکل تھا، اس وجہ سے لوگوں نے پناہ اسی میں دیکھی کہ جو کچھ نقل ہے اسے جوں کا توں نقل کرتے رہیں اور اپنی عقل کو تنقید و تمیز کے دردسر سے بچالے جائیں۔

ظاہر ہے کہ تفسیر میں صرف روایات ہی پر پورا پورا اعتماد کر لینا قرآن مجید کی قطعیت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس صورت میں خود قرآن مجید کے الفاظ کا فیصلہ باطل ہو جاتا ہے اور تمام دار و مدار صرف روایات پر رہ جاتا ہے اور روایات بھی تفسیر کی روایات جن کے متعلق ناقدین روایت کا یہ فیصلہ معلوم ہے کہ ان میں روایت کے عام اصولوں کی پروا بہت کم کی گئی ہے۔

بعد کے دور میں فلسفہ و کلام کے زور پکڑ جانے کی وجہ سے جب قرآن کی بارگاہ قدس میں کلامی جدلیات اور فلسفیانہ موشگافیوں کو باریابی حاصل ہوئی تو یہ الجھاؤ اور زیادہ بڑھ گیا۔ اب تک تو خیریت تھی کہ قرآن مجید کی تاویل صرف روایات ہی پر منحصر تھی ہر بات کا سلسلہ صحیح یا غلط طور پر ابن عباس، مجاہد، قتادہ وغیرہم تک پہنچتا تھا لیکن اب وہ لوگ بھی شریک بزم ہو گئے جو نقل سے زیادہ عقل کے دلدادہ اور قرآن مجید کی ہر آیت کو اپنے قالب میں ڈھالنے کے شائق تھے۔ الفاظ قرآن کی حکومت پہلے ہی اٹھ چکی تھی، اس وجہ سے ان کی راہ میں روایات و آثار کے حصار کے سوا کوئی روک نہ تھی۔ یہ حصار مذہبی تقدس اور عام ہر دلعزیزی کی وجہ سے محترم خیال کیا جاتا تھا اس وجہ سے اس کو یک قلم ڈھا دینا ممکن نہیں تھا۔ اس مشکل کو انہوں نے یوں حل کیا کہ روایات و آثار کے وافر ذخیرہ میں سے ہر گروہ نے اتنا اتنا لے لیا جتنا اس کے مذاق اور اس کی خواہشوں کے موافق اس کو نظر آیا، باقی کو بغیر ہاتھ لگائے اپنے حریفوں کے لئے چھوڑ دیا، جو آیتیں اپنے قرارداده مذہب کے موافق معلوم ہوئیں ان کو اپنی تائید میں استعمال کر لیا اور جو بظاہر کسی قدر مخالف نظر آئیں ان

کو آیات متشابہات کی فہرست میں داخل کر دیا۔ اس طرح ایک ہی آیت ایک فریق کے نزدیک محکم بن گئی اور دوسرے فریق کے نزدیک متشابہ۔ منسوخات کے سلسلہ میں قرآن کا ایک بڑا حصہ امت کے لئے بے مقصد ہو ہی چکا تھا اس فرقہ وارانہ تقسیم نے ایک اور بڑے حصہ کو آیات متشابہات کی فہرست میں داخل کر دیا۔

اس اختلاف ونزاع نے آگے بڑھ کر ایک اور فتنہ اٹھایا یعنی سرے سے تمام لفظی دلائل کی قطعیت ہی مشتبہ ومشکوک ہوگئی اور لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ چونکہ زبان اور کلام کی بنیاد تمام تر نقل پر ہے اور نقل ایک ظنی چیز ہے، اس وجہ سے الفاظ کی دلالت قطعی نہیں ہوسکتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو آیتیں اپنے مفہوم میں بالکل ظاہر تھیں ان کو بھی، اگر کسی جماعت نے اپنے اختیار کردہ مذہب کے خلاف پایا، آیات متشابہات کی صف میں داخل کر دیا۔

امام رازی فرماتے ہیں:۔

اعلم ان هذا موضع عظيم فنقول ان كل واحد من اصحاب المذاهب يدعى ان الآيات الموافقة لمذهبه محكمة وان الآيات المحكمة الموافقة لقول خصمه متشابهة فالمعتزلى يقول قوله تعالىٰ "فمن شاء فليومن ومن شاء فليكفر" محكم و قوله "و ما تشاؤن الا ان يشاء الله رب العالمين" متشابه و السنى يقلب الامر فى ذلك فلابد ههنا من قانون يرجع اليه (۱).

یہ ایک نہایت اہم مقام ہے۔ ہر فرقہ دعویٰ کرتا ہے کہ جو آیتیں اس کے مذہب کے موافق ہیں وہ محکم ہیں اور جو اس کے فریق کے مذہب کے موافق ہیں وہ متشابہ ہیں معتزلی کا دعویٰ ہے کہ فمن شاء فلیومن الخ محکم ہے اور وما تشاؤن الخ متشابہ اور اہل سنت اس کے برعکس دعویٰ کرتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ اس کے متعلق کوئی قانون بنایا جائے۔

---

(۱) التفسير الكبير ۷/۱۶۹

یہ قانون امام رازیؒ کے نزدیک، خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:

فنقول ان اللفظ اذا كان محتملا لمعنيين و كان بالنسبة الىٰ احلهما راجحاً بالنسبة الىٰ الآخر مرجوحا فان حملناه علىٰ الراجح ولم نحمله على المرجوح فهذا هو المحكم واما ان حملناه على المرجوح ولم نحمله على الراجح فهذا هو المتشابه فنقول صرف اللفظ عن الراجح الىٰ المرجوح لا بد فيه من دليل منفصل وذلک الدليل المنفصل اما ان يكون لفظيا و اما ان يكون عقليا .(١)

ہم کہتے ہیں کہ جب کوئی لفظ دو معنوں کا متحمل ہو اور ایک معنی میں راجح اور دوسرے معنی میں مرجوح ہو اور ہم مرجوح سے ہٹ کر اس کو راجح پر محمول کریں تو یہ محکم ہے اور اگر ہم راجح سے ہٹ کر مرجوح پر محمول کریں تو یہ متشابہ ہے۔ پس ہم کہتے ہیں کہ لفظ کو راجح سے مرجوح کی طرف ہٹانا کسی علیحدہ دلیل کا محتاج ہے اور یہ علیحدہ دلیل یا تو لفظی ہوگی یا عقلی۔

اب لفظی دلائل کے بارے میں امام رازیؒ کا فتویٰ سنیے:۔

لان الدلائل اللفظية لاتكون قاطعة البتة لان كل دليل لفظى فانه موقوف علىٰ نقل اللغات و نقل وجوه النحو و التصريف و موقوف علىٰ عدم الاشتراک و عدم المجاز و عدم التخصيص و عدم

لفظی دلائل ہرگز قطعی نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر دلیل لفظی، لغات اور وجوہ نحو و صرف کے نقل اور عدم اشتراک، عدم مجاز، عدم تخصیص، وعدم اضمار وعدم معارض عقلی ونقلی پر مبنی ہے اور ان میں سے ہر چیز مظنون پر موقوف ہے اور جو چیز مظنون پر موقوف ہے وہ بدرجہ

(١) التفسير الكبير ٧/ ١٦٩

| | |
|---|---|
| الاضمار و عدم المعارض النقلی و العقلی و کل ذلک مظنون و الموقوف علی المظنون اولیٰ ان یکون مظنونا فثبت ان شیئا من الدلائل اللفظیة لا یکون قاطعا.(۱) | اولیٰ مظنون ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ لفظی دلائل ہرگز قطعی نہیں ہوسکتے۔ (۱) |

لفظی دلائل کے ظنی وغیر معتبر ہوجانے کے بعد صرف ایک چیز باقی رہ گئی تھی ،یعنی عقل لیکن عقل بھی وہ عقل نہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو بخشی ہے بلکہ وہ عقل جو منطقی خیال آرائیوں اور کلامی موشگافیوں کی عادی ہو ،اس طرح قرآن کی باگ کلامی جدلیات کے ہاتھ میں چلی گئی چنانچہ اسی سلسلہ میں امام رازی فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| فاذا کانت المسئلة قطعیة یقینیة کان القول فیها بالدلائل الظنیة الضعیفة غیر جائز مثاله قال الله تعالیٰ لا یکلف الله نفسا الا وسعها. قام الدلیل القاطع ان مثل هذا التکلیف قد وجد علیٰ ما بینا بالبراهین الخمسة فی تفسیر هذه الآیة فعلمنا ان المراد لله تعالیٰ لیس ما یدل علیه ظاهر هذه الآیة. (۲) | جب کہ مسئلہ اپنی جگہ پر قطعی یقینی ہو تو اس کے بارہ میں ظنی اور کمزور دلایل کی بنا پر کچھ کہنا ناجائز ہے مثلاً لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا (اللہ تعالیٰ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا) کے متعلق قطعی دلائل سے ثابت ہوچکا ہے کہ اس قسم کی تکلیف مالا یطاق اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیتا ہے۔ہم اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں اس کی تائید میں پانچ نہایت محکم دلیلیں لکھ چکے ہیں۔پس ظاہر ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد وہ نہیں ہوسکتی جو ظاہر |

(۱) التفسیر الکبیر ۷/ ۱۶۹

(۲) أیضاً ۷/ ۱۶۹

آیت سے معلوم ہوتی ہے۔

امام رازیؒ اور تمام اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو تکلیف مالا یطاق دیتا ہے یعنی ان پر وہ بوجھ ڈالتا ہے جس کے اٹھانے کی قابلیت اس نے ان کے اندر نہیں رکھی ہے اس مسئلہ کی تائید میں، انہوں نے سورہ بقرہ کی آیت ۶ اور مذکورہ بالا آیت کے تحت متعدد دلیلیں بیان کی ہیں۔اس کے علاوہ تفسیر میں جہاں کہیں ضرورت محسوس کی ہے اس کے دلائل کی تفصیل کی ہے لیکن مذکورہ آیت ان کو اپنے مذہب کے صریح خلاف اور حریفوں یعنی معتزلہ کے مذہب کی علانیہ موید نظر آئی۔اس سے بچنے کے لئے انہوں نے اولاتو اس کے نظم کو الٹا پلٹا لیکن جب اس سے تشفی نہ ہوئی تو اپنی برہانیات کا ترکش سنبھالا لیکن تمام ترکش خالی کر دینے کے بعد جب اس سے بھی قلب کو پورا اطمینان نہ ہوا تو وہ شمشیر آبدار بے نیام کی جس کی کاٹ کے لئے کوئی سپر نہیں تھی یعنی یہ اعلان کر دیا کہ اگرچہ آیت کے الفاظ صاف صاف پکار رہے ہیں کہ خدا بندوں کو تکلیف مالا یطاق نہیں دیتا ہے لیکن ایک دو نہیں بہ۔ پانچ پانچ عقلی دلیلوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ خدا تکلیف مالا یطاق دیتا ہے تو قرآن کی ایک آیت جس کے الفاظ کی دلالت بالکل ظن و سماع پر مبنی ہے، اس محکم قلعہ کو کس طرح منہدم کر سکتی ہے؟ مذکورہ بالا تفصیلات سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں(۱)۔

۱۔صدر اول کے بعد تفسیر قرآن کے باب میں تمام تر اعتماد روایات و آثار پر رہ گیا اور اس میں اس قدر غلو ہوا کہ حق و باطل اور رطب و یابس کی سرے سے تمیز ہی اٹھ گئی۔ ہر طرح کے قصے اور اسرائیلیات تفسیر کی کتابوں میں جگہ پا گئے اور ان روایات پر اس درجہ اعتماد کر لیا گیا کہ خود قرآن کے الفاظ کی دلالت بالکل بے معنی ہو کے رہ گئی۔

۲۔علم کلام کے غلو نے قرآن مجید کی قطعیت کو اور زیادہ مشتبہ کر دیا کیونکہ متکلمین کے نام

(۱) التفسیر الکبیر ۷/ ۱۷۶-۱۷۷

نہاد عقلی دلائل کے مقابل میں خود قرآن کے الفاظ کی دلالت بالکل بے وزن ہو کے رہ گئی اور تفسیر میں تمام تر بھروسہ ان "برہانیات" پر رہ گیا جو ہمارے متکلمین کے ذہنوں کی پیداوار تھیں۔

## ردعمل:

جن لوگوں نے ان تفسیروں کی مدد سے قرآن مجید کو سمجھنا چاہا، ان کو ان باتوں کی وجہ سے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، سخت مایوسی ہوئی اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ یہ مایوسی بڑھتی رہی، یہاں تک کہ یہ حالات پیش آگئے جن سے آج ہم دوچار ہیں، یعنی ایک جماعت نے پوری قوت کے ساتھ روایات اور احادیث کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، ان کا کہنا یہ ہے کہ صحابہ ؓ قرآن مجید کو، اس کے الفاظ کی روشنی میں سمجھتے تھے، ان کو نہ تو روایات کی ضرورت پیش آئی نہ وہ ان متکلمانہ برہانیات کے محتاج ہوئے، پھر آج قرآن مجید کا سمجھنا سمجھانا ابن جریرؒ، امام رازیؒ، قاضی بیضاویؒ اور امام سیوطیؒ کی کتابوں پر کیوں منحصر ہو جائے؟

ان خیالات کو ان لوگوں نے مزید آب و رنگ دے کر چمکایا جو مغربی خیالات سے مرعوب تھے، یہ لوگ قرآن مجید یا خود شریعت اسلام کے متعلق جو سنی سنائی باتیں جانتے تھے، وہ ان کے مذاق اور ان کی عقل پر پوری نہیں اترتی تھیں اور جو کچھ نہیں جانتے تھے اس کے نہ جاننے کا ننگ گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اس لئے سرے سے اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا کہ نہ اس کے وجود کو تسلیم کریں گے نہ اس کی عدم واقفیت کی شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن مجید تو ایک نہایت آسان اور سادہ کتاب ہے، اس کے مخاطب اول عرب تھے، جو بالکل وحشی اور بدوی تھے اور صرف موٹی موٹی باتیں ہی سمجھ سکتے تھے، ایسی قوم کو ایک ایسی کتاب دینا، جس کے اسرار و رموز کی نسبت یہ کہا جاتا ہو کہ اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے۔ ایک بے معنی اور مہمل بات اور خدا کی

حکمت کے بالکل منافی ہے۔قرآن مجید دنیا کے تمام انسانوں کے لئے صحیفہ رشد وہدایت بن کر نازل ہوا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ نہایت سہل ہو، اگر وہ دقیق اسرار پر مشتمل ہوگا تو دنیا اس کے فوائد سے محروم رہ جائے گی اور بندوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت قائم نہ ہو سکے گی۔اس خیال کی تائید میں وہ ان آیتوں سے سند پکڑتے ہیں، جن میں ایسے الفاظ آئے ہیں جو ان کے زعم میں قرآن مجید کے سہل اور آسان ہونے کو ظاہر کرتے ہیں۔اس کے بعد حدیثوں اور روایتوں سے وہ یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں کہ یہ ظنیات ہیں۔اگر قرآن مجید کی تاویل وتفسیر کی بنیاد ان ظنیات پر رکھی گئی تو قرآن کی قطعیت برباد ہو جائے گی۔اس طرح وہ بے روک ٹوک اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ قرآن کے سمجھنے کے لئے عربی زبان کے علم کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

ان تمام خیالات کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہماری معروضات سنیئے:

## کلام کے مشکل اور آسان ہونے کے تین پہلو:

کسی کلام پر مشکل اور آسان ہونے کا حکم تین اعتبارات سے لگایا جا سکتا ہے:

ا۔خود کلام کے اعتبار سے۔یعنی اگر کسی کلام میں الفاظ نامانوس ہوں، عبارت میں پیچیدگی ہو، قواعد نحو وصرف اور محاورہ عام کی مخالفت ہو۔اس میں استعارات دور از کار، تلمیحات بعید از فہم، تشبیہات غیر واضح اور کنایات ناقابل فہم ہوں تو وہ کلام مشکل ہوگا۔برعکس اس کے اگر الفاظ ومحاورات معروف ہوں، جملوں کی ترتیب اور ترکیبوں کی نشست میں کوئی اینچ پیچ نہ ہو، قواعد زبان کے مروج اصولوں کی پوری رعایت ہو تو وہ کلام شستہ، پاکیزہ، سہل اور آسان ہوگا، غالب کے کلام کا جو حصہ بیدل کے رنگ میں ہے وہ ہر شخص کو مشکل اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے لیکن جس حصہ میں خود ان کا اپنا رنگ ہے اس کا ایک ایک مصرعہ سادگی، بلاغت اور دل نشینی کی نہایت عمدہ مثال ہے۔

۲۔ مضمون کے اعتبار سے بعض مضامین خود سہل ہوتے ہیں مثلاً قصے، تاریخ، ناول، افسانے اور قانون وغیرہ بعض مشکل ہوتے ہیں مثلاً فلسفہ، منطق، اقلیدس، ریاضی، معاشیات وغیرہ پہلی قسم کے مضامین زیادہ غور وفکر کے محتاج نہیں ہوا کرتے انکو ہر شخص پڑھتا ہے اور آسانی سے سمجھ لیتا ہے لیکن فلسفہ کی کسی کتاب کو کوئی شخص ناول کی روانی کے ساتھ پڑھ کر نہیں سمجھ سکتا۔

۳۔ مخاطب کے اعتبار سے۔ غالب کی ایک سادہ غزل ایک ابجد خواں کیلئے نہایت مشکل ہے لیکن اگر ایک ماہر فن کے سامنے ان کے مشکل اشعار بھی پیش کیجئے تو وہ آسانی سے سمجھ لے گا۔

ان امور کو پیش نظر رکھ کر اب قرآن مجید کے سہل اور آسان ہونے پر غور کیجئے۔ قرآن مجید ایک ایسا کلام ہے جس کی بلاغت کی تمام عرب وعجم بلکہ سماء دنیا کے نیچے کوئی دوسری نظیر نہیں ہے۔ ایسے کلام کی نسبت پہلے اعتبار سے تو ظاہر ہے کہ کوئی بحث ہو نہیں سکتی کیونکہ کلام کا یہ عیب متکلم کی عدم قدرت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے اور قرآن مجید جس کا کلام ہے وہ جملہ عیوب سے پاک ہے، اس لئے قرآن مجید جس زمانہ میں اترا ہے اس زمانہ کی فصاحت وبلاغت کی تمام خوبیوں کا حامل ہے۔ یہاں تک کہ اس کے مخاطب، جو دنیا میں کلام کے بہترین نقاد تھے، اس کے ایک ایک حرف سے بیزار ہونے کے باوجود یہ اعتراف کرتے تھے کہ یہ سحر (۱) ہے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ اس کے مثل تم ایک ہی سورہ لاؤ (۲) اس کے لئے تم اپنی تمام ارضی وسماوی قوتیں فراہم کرلو، اس مطالبہ کا ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ یہ جادو ہے۔

ایک ایسے کلام میں نحو وصرف کے عام قواعد کی رعایت، نامانوس الفاظ ومحاورات سے اجتناب، تعقیدات اور عقل آزما ابہامات سے احتراز اور اس قبیل کی دوسری خوبیاں اس قدر

(۱) المدثر: ۲۴

(۲) البقرۃ: ۲۳

ابتدائی درجہ کی چیزیں ہیں کہ ان کی نسبت سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا، پس اس اعتبار سے بلاشبہ یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید نہایت کھلا ہوا اور آسان ہے۔

اب دوسرے پہلو سے غور کیجئے، یعنی موضوع و مضمون کے اعتبار سے۔قرآن مجید اپنے موضوع اور مضامین کے اعتبار سے کلام کی کس صنف میں داخل ہے؟ جولوگ قرآن مجید کی گوناگوں خصوصیات سے اچھی طرح آشنا ہوں گے وہ اس کا جواب یہی دے سکتے ہیں کہ وہ مذکورہ بالا دونوں صنفوں سے بالکل الگ چیز ہے لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ مسلمانوں میں اس کے متعلق عام طور پر ایک مبہم سا خیال یہ پیدا ہوگیا ہے کہ یہ احکام و قوانین کا ایک مجموعہ ہے۔اس غلط فہمی میں جس طرح عوام مبتلا ہیں اسی طرح بہت سے علماء بھی مبتلا ہیں۔جدید تعلیم یافتہ لوگ بھی اسی قسم کی غلط فہمی کے شکار ہیں۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ لوگ دین کے متعلق اس سے زیادہ بلند تصور ہی نہیں کرسکتے کہ وہ حرام وحلال کے بتانے کا ایک ضابطہ ہے۔چنانچہ بہت سے لوگ فقہ کی جزئیات وکلیات علیحدہ مرتب ہوجانے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت محض تبرکاً ہی ضروری سمجھتے ہیں، علم ویقین پیدا کرنے اور ذہن وفکر کی ترتیب کے نقطہ نظر سے اس کو کچھ زیادہ سودمند نہیں خیال کرتے۔ان خیالات کے پیدا ہونے اور پھیلنے کی ایک تاریخ ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے تاہم بعض وجوہ کی طرف اشارہ ناگزیر ہے۔

ا۔پہلی وجہ ہمارے علماء کی یہ عام غلط فہمی ہے کہ دین میں عقل کو دخل نہیں ہے۔ان کا خیال یہ ہے کہ ہم جن باتوں پر ایمان لاتے ہیں پیغمبر کے کہنے سے ایمان لاتے ہیں۔اور پیغمبر کو کسی عقلی دلیل سے نہیں بلکہ معجزہ کے ذریعہ سے پہچانتے ہیں اگر دین میں عقل کو دخل ہوتا تو وحی کی کیا ضرورت تھی اور ایمان بالغیب کی تعریف کیوں کی جاتی؟ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک دین اس قدر سادہ اور حقیر چیز ہو وہ قرآن مجید کو چند اوامر اور چند نواہی کے ضابطہ سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔اور اس طرح کے ضابطہ کو سمجھنے کے لئے یقیناً کسی خاص

غور و تدبر کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص اس کو پڑھ کر نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یونانی علوم کا رواج ہے جو لوگ فلسفہ و منطق کے مطالعہ میں مشغول ہوئے انہوں نے قرآن مجید کو کرنے اور نہ کرنے کی باتوں کے ایک منتشر مجموعہ اور وعظ و نصیحت کے ایک خشک دفتر سے زیادہ وقعت نہ دی۔ وہ نہایت پست اور راہ فطرت و ہدایت سے ہٹی ہوئی عقلیات میں الجھ گئے اور انہوں نے یہ گمان کر لیا کہ توحید و رسالت کے مسائل پر فلسفہ ہی سے دلیل لائی جا سکتی ہے۔ مذہب خود اپنی حمایت سے عاجز ہے، اس وہم نے ان لوگوں کو قرآن مجید سے بہت دور کر دیا اور چونکہ یونانی عقلیات نے ایک طویل زمانہ تک ذہنوں اور دماغوں پر فرمانروائی کی تھی، اس وجہ سے ان کا رعب دلوں پر اس قدر چھایا ہوا رہا کہ اگر کسی پر قرآن کی اصلی عظمت کچھ بے نقاب ہوئی بھی تو وہ عام خیال کے خلاف کچھ بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔

۳۔ تیسری وجہ عربوں کی جہالت کا وہ عام اعتقاد ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ افسوس ہے کہ عربوں کے متعلق ہمارے علماء اور نئے تعلیم یافتہ حضرات سبھی غلط فہمی میں مبتلا ہیں ہمارے علماء کے نزدیک تو اسلام اور قرآن کا کمال ظاہر ہو ہی نہیں سکتا جب تک عربوں کو چوپایوں سے بھی بدتر نہ ثابت کر دیں۔ رہے نئے تعلیم یافتہ حضرات تو یہ لوگ بھی زمانہ نزول اسلام کے جاہل اور وحشی عربوں میں کسی طرح ذہنی و دماغی صلاحیت و استعداد کا تصور نہیں رکھتے۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ قرآن مجید صرف چند احکام اور چند مواعظ کا سیدھا سادھا مجموعہ ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص کسی عربی اخبار یا رسالہ کا غلط صحیح ترجمہ کر سکتا ہے تو وہ قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا بھی حق رکھتا ہے۔ حالانکہ عربوں کے متعلق یہ نہایت غلط خیال ہے جس شخص نے ان کے ادب کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ کیا ہو گا وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ذہنی اعتبار سے عرب زمانہ جاہلیت میں بھی اپنی دوسری معاصر قوموں سے کسی طرح پیچھے نہیں تھے۔

الغرض عوام اور خواص دونوں نے قرآن مجید کو اس کے اصلی رتبہ سے بہت نیچے گرا کر دیکھا، عوام دل کی خلشوں اور عقل کی الجھنوں سے آزاد ہوتے ہیں اور دین کو محض تقلیداً مانتے ہیں۔ ان کو دین کی ضرورت صرف اس لئے ہوتی ہے کہ حرام و حلال کو معلوم کر لیں اور مذہب کے ظاہری رسوم و فرائض سے آشنا ہو جائیں۔ اس ضرورت کے پوری ہو جانے کے بعد نہ مزید کسی شئے کی ان کو ضرورت ہے اور نہ اس سے زیادہ وہ کسی چیز کا تصور کر سکتے۔ باقی رہے علما تو وہ عموماً اس بدگمانی کی وجہ سے قرآن مجید کی طرف متوجہ نہ ہو سکے، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، انہوں نے قرآن مجید کو صرف ایک مجموعہ احکام و قوانین کی حیثیت سے دیکھا جس میں ضمناً بطور پند و موعظت کے گزشتہ قوموں کے قصے اور گمراہ فرقوں کے اعمال و عقائد وغیرہ بھی بیان ہو گئے ہیں اور کہیں کہیں توحید و معاد وغیرہ کی وہ موٹی موٹی دلیلیں ذکر کر دی گئی ہیں جو عوام کے لئے کافی ہو سکیں جو لوگ قرآن کو معجزہ کی بنیاد پر مانتے تھے ان کو تو اس سے زیادہ کی سرے سے کوئی طلب ہی نہیں تھی، مگر جنہوں نے اس سے زیادہ کی ضرورت سمجھی بھی تو وہ قرآن کی جگہ یونانی علوم میں مشغول ہو گئے۔

## قرآن کا مقصد نزول:

قرآن مجید کے متعلق اس سے زیادہ مہلک بدگمانی کوئی اور نہیں ہو سکتی، اس لئے ضرورت ہے کہ اس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

سب سے پہلے اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیے کہ قرآن مجید کا مقصد نزول کیا ہے؟ قرآن مجید میں آدم علیہ السلام اور شیطان کا قصہ متعدد سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شیطان نے خدا کے حکم کے خلاف آدم کو غرور اور حسد کی وجہ سے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو خدا نے شیطان کو حکم دیا کہ:-

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ اَنْ　　فرمایا: پھر تو یہاں سے یعنی جنت سے اتر،

تَکَبَّرَ فِیْهَا فَاخْرُجْ اِنَّکَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ. (۱)

تجھے یہ حق نہیں ہے کہ تو اس میں گھمنڈ کرے،تو نکل،یقیناتو ذلیلوں میں سے ہے۔

اس پر شیطان نے کچھ مہلت مانگی اور جوش حسد میں جھلا کر کہا:

قَالَ فَبِمَا اَغْوَیْتَنِی لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ وَلَاتَجِدُ اَکْثَرَهُمْ شَاکِرِیْنَ (۲)

بولا: چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان لوگوں کے لئے گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے، ان کے پیچھے، ان کے داہنے اور ان کے بائیں سے ان پر تاخت کروں گا تو ان میں اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔

بالآخر شیطان نے حضرت آدم کو فتنہ میں ڈالنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے مہلت حاصل کر لی اور ان کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ دونوں کو جنت سے نکلنے کا حکم ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ حکم دیا۔

اِهْبِطُوا بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ (۳)

فرمایا: اترو، تم ایک دوسرے کو دشمن ہو اور تمہارے لئے زمین میں ایک وقت خاص تک ٹھہرنا اور کھانا پینا ہے۔

آدمؑ اور ان کی ذریت کے لئے یہ مرحلہ بہت کٹھن تھا۔ وہ دنیا میں شیطان کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں جو ایک طرف جوش حسد اور جذبہ انتقام سے اس قدر بھرا ہوا ہے کہ پہلے ہی

---

(۱) الاعراف :۱۳

(۲) أیضاً :۱۶-۱۷

(۳) أیضاً :۲۴

دن الٹی میٹم دیتا ہے کہ ''میں ان کے آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے ان کی راہ ماروں گا اور ان میں اکثر کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا''۔ اور دوسری طرف اس قدر شاطر اور چالاک ہے کہ ایک ہی چکمے میں آدم کے عزم وثبات کے تمام تار و پود بکھیر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری تھا کہ رحمت الٰہی آدمؑ کو کوئی ایسا ہتھیار بھی دیتی جو اس پرفریب دشمن کے مقابلہ میں کام آتا اور ان کی ذریت اس کے بے پناہ حملوں سے محفوظ رہ سکتی۔ چنانچہ اللہ نے آدمؑ اور ان کی ذریت کو اس کے مقابلہ کے لئے ایک ہتھیار عنایت فرمایا اور ان کو مندرجہ ذیل الفاظ میں تسلی دی:

| | |
|---|---|
| فَاِمَّا یَاتِیَنَّکُمْ مِنِّی هُدیً فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُونَ (۱) | تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ |

اسی وعدہ کا ذکر سورہ اعراف میں بھی ہے۔

| | |
|---|---|
| یَا بَنِی آدَمَ اِمَّا یَاتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِنْکُمْ یَقُصُّونَ عَلَیْکُمْ آیَاتِی فَمَنِ اتَّقیٰ وَ اَصْلَحَ فَلا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُونَ. (۲) | اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں تم کو میری آیات سناتے تو جو ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی ان کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ |

آدمؑ کو شیطان سے دنیا میں خوف اور قیامت میں غمگینی کا جو اندیشہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ کے ذریعہ سے اس کو دور کر دیا۔

اس وقت اس قصہ کے اسرار و رموز سے بحث نہیں کرنی ہے، صرف یہ دکھانا ہے کہ

(۱) البقرة :۳۸

(۲) الاعراف :۳۵

قرآن نے جوعلم الانسان پیش کیا ہے اور انسانی ارتقاء کی جو تاریخ بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں اس میں ایک ایسا خلا بھی ہے کہ جب تک خدا کی طرف سے انبیاء علم قطعی لے کر نہ آئیں وہ شیطان کے فتنوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا بلکہ ہر قدم پر اس کے لئے خطرہ ہے کہ وہ فطرت کے عہد سے ہٹ کر گمراہی کے راستوں پر پڑ جائے۔ اس لئے ضروری یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اولاد آدم کی ہدایت کے لئے اپنے انبیاء بھیجے جو اس امتحان گاہ میں ان کو عہد فطرت کی یاد دہانی اور صراط مستقیم کی ہدایت کرتے رہیں۔

جو لوگ قرآن مجید سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کا مفہوم نہایت وسیع ہے شیطان جس طرح جنات میں سے ہوتے ہیں اسی طرح انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور جس طرح وہ انسان کے اعمال واخلاق کو بگاڑتے ہیں اسی طرح انسان کی عقل پر بھی حملہ کر کے اس کو ماؤف کر دیتے ہیں۔ سورہ الناس میں ہے:

| | |
|---|---|
| اَلَّذِی یُوَسْوِسُ فِی صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الجِنَّةِ وَ النَّاسِ .(۱) | جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے جنوں میں سے اور انسانوں میں سے |

سورہ بقرہ میں ہے:

| | |
|---|---|
| وَاِذَا لَقُوا الَّذِینَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَاِذَا خَلَوا اِلیٰ شَیَاطِینِهِمْ قَالُوا اِنَّا مَعَکُمْ. (۲) | اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کی مجلسوں میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔ |

(۱) الناس :۵-۶

(۲) البقرة :۱۴

پھراس کی چالا کی اور گمراہ کرنے کے فن کا یہ حال بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ .(۱) — وہ اور اس کا جتھہ تم کو وہاں سے تاڑتا ہے جہاں سے تم ان کو نہیں تاڑتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں گمراہی اور ضلالت جن بھیسوں اور جن شکلوں میں بھی آئے وہ شیطان ہی کی طرف سے آتی ہے اور جن و بشر میں سے جو شریر وجود بھی خدا کی صراط مستقیم سے بہکائے اور مخلوق خدا کی راہ مارے وہ شیطان ہے شیطان کے بھیس ان گنت اور اس کے داؤ بے شمار ہیں۔انسان کے اندر جتنی ظاہری اور باطنی قوتیں ودیعت ہیں، سب کی گھاٹیاں اس کو معلوم ہیں، وہ ہر دروازے سے گھستا اور ہر راستہ سے نکلتا ہے۔وہ خون بن کر رگوں میں دوڑتا ہے، جذبات وشہوات کی صورت میں ہیجان میں آتا ہے۔حسن بن کر لبھاتا ہے، عشق بن کر چٹکیاں لیتا ہے، امید وتمنا کے سبز باغ دکھا کر اچھالتا ہے۔پھر مایوسی کی کمند ڈال کر پچھاڑ دیتا ہے۔اس کے پاس طرح طرح کے واعظانہ لطیفے اور حکیمانہ نکتے ہیں۔وہ منطقیوں کی طرح صغریٰ وکبریٰ تراشتا ہے، فلسفیوں کی طرح سیاست اور فرمانروائی کے نکتے بیان کرتا ہے اور جب ان تدبیروں سے بھی بنی آدم کی مخالفت اور دشمنی کا جوش ٹھنڈا نہیں پڑتا تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدعی نبوت بن کر نبوت کرنے لگ جاتا ہے۔ایسے ہوشیار دشمن کے فتنوں سے انسان کو بچانے کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کتاب دی جائے وہ اگر محض چند قوانین اور چند نصیحتوں کا سیدھا سادھا مجموعہ ہو تو غور کیجئے کہ ایسا معمولی ہتھیار اتنے خوفناک دشمن کے مقابلہ میں کیا کام دے سکتا ہے؟

یہ ایک ضمنی بات تھی، اصلی بات جو کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اس وعدے کے مطابق خدا نے بنی آدم کی رہبری اور ہدایت کے لئے انبیاء مبعوث فرمائے اور کتابیں نازل کیں۔یہاں تک کہ اس آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھیجا جس کی نسبت اگلے صحیفوں میں پیشین گوئی کی

(۱) الاعراف :۲۷

گئی تھی کہ اس کی لائی ہوئی روشنی دنیا کے ساتھ ہمیشہ رہے گی۔ قرآن مجید میں اس رسول کی صفت سورہ جمعہ میں یہ بیان کی گئی ہے۔

| | |
|---|---|
| هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ. (۱) | اسی نے اٹھایا ہے امیوں میں ایک رسول انہی میں سے جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ |

یہ اس دعا کی قبولیت کا اعلان ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی۔

| | |
|---|---|
| رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُزَکِّیْهِمْ. (۲) | اور اے ہمارے رب، تو ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ |

اس آیت میں پیغمبر ﷺ کی چار صفتیں بیان ہوئی ہیں۔

۱۔ تلاوت آیات

۲۔ تزکیہ

۳۔ تعلیم کتاب

۴۔ تعلیم حکمت

اور چونکہ انہی صفات کا مجموعہ قرآن مجید ہے اس وجہ سے ضرورت ہے کہ ان کی تشریح کی جائے تاکہ قرآن مجید کی حقیقت واضح ہو۔

(۱) الجمعة : ۲

(۲) البقرة : ۱۲۹

## تلاوت آیات اور تزکیہ:

پہلی چیز تلاوت آیات ہے یعنی اللہ تعالٰی کی آیتوں کا سنانا۔ آیت کا لفظ، قرآن مجید میں، مختلف معانی کے لئے استعمال ہوا ہے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ آیت مذکورہ بالا میں یہ لفظ دلیل اور حجت کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد خاص طور پر قرآن مجید کا وہ حصہ ہے جو دلائل اور براہین پر مشتمل ہے۔ قرآن مجید کے لئے اس لفظ کے استعمال سے، اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ اپنی تعلیمات پر خود دلیل و حجت ہے، کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔

جو لوگ قرآن مجید کی ترتیب نزول سے واقف ہیں، ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ اوائل نبوت میں قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہوا ہے وہ دین کے ان کلیات سے متعلق ہے جو تمام دین کے لئے بمنزلہ اساس و بنیاد ہیں۔ جس طرح ایک عمارت اس وقت تک تعمیر نہیں ہو سکتی جب تک اس کی بنیاد استوار نہ ہو اسی طرح دین کا قیام بھی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کے کلیات اچھی طرح ذہنوں میں راسخ نہ ہوں۔ اسلام کا پورا نظام تین محکم بنیادوں پر قائم ہے۔ توحید، معاد اور رسالت اور ان تینوں کی بنیاد فطرت اور آفاق کی نہایت مضبوط دلیلوں پر قائم ہے۔ قرآن مجید نے سب سے پہلے ان بنیادوں کو استوار کیا۔ ان کی استواری سے وہ غلط نقوش خود بخود مٹ گئے جو شرک، انکار معاد اور انکار نبوت کی وجہ سے قائم ہو گئے تھے۔ ان بنیادوں کو قرآن نے کس طرح قائم کیا اور ان غلط عقائد کو کن دلائل سے باطل کیا؟ اس سوال کا جواب محتاج تفصیل ہے۔ اس کیلئے ہماری کتابیں حقیقت شرک اور حقیقت توحید وغیرہ پڑھنی چاہئیں (۱)۔

(۱) کتاب مذکور ہندوستان میں مرکزی مکتبہ اسلامی سے علاحدہ اور پاکستان میں فاران فاؤنڈیشن سے ایک مجموعہ کی شکل میں شائع ہو چکی ہے

یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس موقع پر آیت سے قرآن مجید کا وہ حصہ مراد ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کے دلائل و براہین پر مشتمل ہے۔ابتدا میں قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہوا وہ فقہی احکامات سے بالکل خالی ہے۔اس میں صرف مذہب کے ان بنیادی اور اساسی مسائل سے بحث ہے جو دین کے پورے نظام کے لئے شیرازہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عقلا ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔کیونکہ کوئی تعلیم بغیر بنیاد و اساس کے قائم نہیں رہ سکتی۔جب آپ کوئی عمارت بناتے ہیں تو بام و در سے نہیں شروع کرتے بلکہ پہلے بنیاد کو محکم کرتے ہیں۔یہی حال مذہب کا ہے۔اس کی تمام جزئیات چند کلیات کے ماتحت ہیں اور جب تک یہ کلیات مستحکم نہ ہولیں اس وقت تک جزئیات اور شاخوں کا وجود میں آکر قائم رہنا ناممکن ہے۔

ان کلیات کی بنیاد انسان کی فطرت کے باطن میں موجود ہوتی ہے۔اس وجہ سے فطرت اگر اوہام وخرافات کے گرد وغبار سے اٹ نہیں گئی ہے تو آفتاب نبوت کی پہلی ہی کرنوں سے چمک اٹھتی ہے۔

يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ (۱) اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے۔

درد دل ہر کس که از دانش مزه است
روی و آوازه پیمبر معجزه است

لیکن اگر فطرت فاسد خیالات اور باطل عقائد کی آلودگیوں سے نجس ہوگئی ہے تو اس کو صاف کرنا پڑے گا۔جب تک یہ اچھی طرح صاف نہ ہولے، کسی عمدہ تعلیم کو یہ قبول نہیں کرسکتی۔جس طرح ایک مریض معدہ صالح سے صالح غذا ہضم نہیں کرسکتا۔اس وجہ سے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اس کے امراض کی تشخیص کی جائے اس کو دوائیں پلائی جائیں اور جب وہ

(۱) النور :۲۵

تندرست ہوجائے تب اس کو غذا دی جائے۔ بغیر اس کے اگر غذا دے دی گئی تو طبیعت قبول نہیں کرے گی۔ سورہ انعام میں ایسے ہی آلودہ فطرت انسانوں کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

وَمَنْ يُرِدْ اَنْ يُضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَاءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُوْمِنُوْنَ. (۱)

اور اللہ جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے۔ گویا اسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہے۔ اسی طرح اللہ ناپاکی مسلط کر دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے

پس تلاوت آیات کے بعد مذکورہ بالا آیت میں تزکیہ کا ذکر آیا ہے تو یہ در حقیقت نتیجہ ہے تلاوت آیات کا۔ اللہ کی آیات کی تلاوت سے انسان کے دل سے باطل خیالات وعقائد کی جڑیں جب کٹ جاتی ہیں تو اس کے دل کی زمین صحیح خیالات وعقائد کی تخم ریزی کے لئے بالکل صاف و پاک ہوجاتی ہے۔

یہ بات اپنی جگہ ثابت ہے کہ خدا نے فطرت میں خیر و شر کی تمیز ودیعت کی ہے جس طرح انسان حواس خمسہ کی مدد سے خوبصورت اور بدصورت میں امتیاز کرتا ہے، سیاہ اور سفید کو پہچانتا ہے، خوشبو اور بدبو میں فرق کرتا ہے، اسی طرح اس کی فطرت کے باطن میں ایک روشنی موجود ہے جو نیک و بد کے امتیاز میں اس کی رہبری کرتی ہے۔ سورہ قیامہ میں ہے

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے۔ (۲)

دوسری جگہ ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا. (۳) پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔

(۱) الانعام: ۱۲۵

(۲) القیامۃ: ۱۴

(۳) الشمس: ۸

ایک اور مقام پر فرمایا ہے:

اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ.(۱) ہم نے اس کو راہ بجھادی۔

جن لوگوں میں یہ روشنی، شہوات کی پیروی اور محبت دنیا کی وجہ سے گل ہو جاتی ہے وہ روحانی اعتبار سے بالکل مردہ ہو جاتے ہیں۔ پیغمبر اپنی تعلیم کی تیز شعائیں کتنی ہی قوت و شدت کے ساتھ ان پر ڈالے ان میں کوئی حرکت اور حرارت نمودار نہیں ہوتی۔ ایسے ہی لوگوں کی بابت فرمایا ہے:

اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ (۲) تم مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں۔

اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ وَ الْمَوْتٰی یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ (۳) بات تو وہی مانیں گے جو سنتے سمجھتے ہیں، رہے یہ مردے تو اللہ ان کو اٹھائے گا پھر یہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

سورہ بقرہ کے شروع میں جن لوگوں کے دلوں پر مہر کرنے کا ذکر ہے وہ اسی طرح کے لوگ ہیں۔

لیکن جن دلوں کے اندر روشنی موجود ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی دھندلی اور کمزور کیوں نہ ہو، پیغمبر تلاوت آیات کے ذریعہ سے ان کو روشن تر کر دیتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ پیغمبر ہمارا تزکیہ ہماری فطرت کے مطابق کرتا ہے۔ ہماری فطرت کے اندر نیکی و بدی کی پہچان کے جو بنیادی اصول موجود ہیں وہ پہلے ان کو پاک وصاف کر کے نمایاں کرتا ہے اور پھر انہی پر تمام تعلیمات کی عمارت تعمیر

(۱) الدھر ۷۶:۳

(۲) النمل ۲۷:۸۰

(۳) الانعام ۶:۳۶

کرتا ہے۔

لیکن تزکیہ کے متعلق یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ کوئی مفرد اور سادہ عمل نہیں ہے بلکہ یہ کئی جزوں کا مرکب ہے۔اس کا موضوع نفس انسانی ہے جو علم اور عمل دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اس لئے تزکیہ کے بھی دو پہلو ہیں: تزکیہ علم اور تزکیہ عمل ،اس اعتبار سے تزکیہ انسان کے تمام اعمال اور تمام عقائد پر حاوی ہو جاتا ہے اور چونکہ انسان کے تمام اعمال کا سرچشمہ عقائد ہی ہیں اس لیے پیغمبر اپنی تعلیمات سے سب سے پہلے عقائد یعنی لوگوں کے علم وادراک کا تزکیہ کرتا ہے۔

تزکیہ علم کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا علم تمام کثافتوں اور آلودگیوں سے اس قدر صاف اور مجلی ہو جائے کہ وہ فکر و نظر کے تمام گوشوں میں لغزشوں سے محفوظ رہ سکے اور اگر کبھی نفس وشیطان کی فتنہ انگیزیوں سے اس پر غبار آ جائے تو معمولی توجہ سے صاف ہو جائے اور تزکیہ عمل کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے تمام نشیب وفراز میں انسان کا کوئی قدم خواہشوں کی رہنمائی میں نہ اٹھے بلکہ اللہ تعالی کے منشا کے مطابق اٹھے اور اگر نفس کی شرارت یا جذبات کے غلبہ کی وجہ سے کوئی قدم غلط اٹھ جائے تو تنبیہ ہوتے ہی اس غلط اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لے اور توبہ وندامت سے اس کی تلافی کرے۔سورہ اعراف میں ایسے ہی لوگوں کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ:

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُبْصِرُوْنَ. (۱) | جولوگ خداترس ہیں جب ان کو کوئی شیطانی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے وہ خدا کا دھیان کرتے ہیں اور دفعۃ ان کے دل روشن ہوجاتے ہیں |

اب آیئے صرف تزکیہ علم ہی کے معاملہ کو لے کر اس پر غور کیجئے کہ تنہا اسی چیز کے

(۱) الاعراف : ۲۰۱

کتنے پہلو ہو سکتے ہیں۔ایک کسان جو کھیت میں ہل چلاتا ہے، وہ بھی فکر ونظر کرتا ہے۔اور ایک حکیم، جو اسرار کائنات کی گتھیاں سلجھاتا ہے، وہ بھی فکر ونظر کرتا ہے لیکن دونوں کے فکر و نظر میں کتنا فرق ہے! ایک کسان کے فکر ونظر کی جو آخری حد ہے۔ایک حکیم کے فکر ونظر کا پہلا قدم بھی اس سے منزلوں آگے پڑتا ہے اور ایک حکیم کے فکر ونظر کے جو مبادی ہیں وہ عامیوں کے تمام علم وادراک کی سدرۃ المنتہٰی سے بھی پرے ہیں؛

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اسی طرح ان میں سے ایک کے شبہات وشکوک محض تقلیدی ہوتے ہیں جو حق کی ایک ضرب کی بھی تاب نہیں لاسکتے اور بڑی آسانی سے پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔اور دوسرے کی گمراہیاں اپنی تائید میں منطق وفلسفہ کے بہت سے دلائل فراہم کر لیتی ہیں جن کو شکست دینے کے لئے نہایت طاقتور دلیلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔اس وجہ سے قرآن، اگر نوع انسانی کے تمام طبقات کے تزکیہ علم وعمل کے لئے آیا ہے تو ضروری ہے کہ اس کے دلائل و براہین دونوں کیلئے تشفی بخش ہوں۔ پہلے کو جو کچھ دے اس کا معیار اس کی استعداد اور اس کی عقل سے بلند نہ ہو اور اس کی جن غلطیوں کی اصلاح کرے اس کے لئے ایسے سادہ اور دلنشیں دلائل استعمال کرے کہ ان کی دلپذیری ان کو گرویدہ کر لے۔اسی طرح دوسرے کو جو کچھ سکھلائے اس کا معیار اتنا بلند ہو کہ اس کے دل کو طمانیت اور اسکی روح کو تسلی حاصل ہو اور جو کچھ اس سے چھینے اس کو ایسے اٹل اور محکم دلائل حکمت سے چھینے کہ منطق وفلسفہ کی کوئی قوت بھی اس کو بچا نہ سکے۔

اس معاملہ کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔وہ یہ کہ انبیاء کرام کے متعلق معلوم ہے کہ وہ نبوت سے پہلے بھی کمال عقل وادراک سے سرفراز ہوتے ہیں۔وہ اپنی پاکیزہ فطرت کی روشنی میں علم وعمل کی وہ منزلیں طے کر لیتے ہیں جن کو دوسرے وحی والہام کی رہبری میں بھی

طے نہیں کر سکتے۔ لیکن علم و عمل کا یہ مقام حاصل کر لینے کے باوجود ان کی تشنگی اور حیرانی بدستور باقی ہی رہتی ہے اور جب تک وحی کی رحمت نازل نہیں ہوتی ان کی یہ تشنگی رفع نہیں ہوتی۔ وہ اپنی حیرانی کو دور کرنے اور اپنے سینہ کے منور ہونے کے لئے برابر وحی الٰہی کی تجلیات کے منتظر رہتے ہیں اور یہ روشنی ان کو اس قدر محبوب ہوتی ہے کہ اس کی زیادتی کے لئے اللہ تعالیٰ سے والہانہ دعائیں کرتے ہیں۔

رَبِّ زِدْنِی عِلْماً (۱) اے میرے رب میرے علم میں افزونی فرما

اور جب یہ حاصل ہو جاتی ہے تو اس کو پا کر تمام مادی تائیدات سے بے نیاز اور تمام دنیاوی مخالفتوں سے بے خوف اور نڈر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ سورہ حجر میں مخالفین اسلام کی سرگرمیوں اور شرارتوں کے ذکر کے بعد پیغمبر ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دی گئی ہے۔

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الجمِيلَ. اِنَّ رَبَّکَ هُوَ الخَلّاقُ العَلِيمُ. وَلَقَدْ آتَيْنَاکَ سَبْعاً مِنَ المَثَانِي وَ القُرآنَ العَظِيمَ. لا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْکَ اِلیٰ مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجاً مِنْهُمْ وَلا تحزَنْ عليهم وَ اخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُومِنِيْنَ. (۲)

تو ان سے خوبصورتی کے ساتھ درگزر کرو، تمہارا رب بڑا ہی پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔ اور ہم نے تم کو سات مثانی اور قرآن عظیم عطا کیے۔ ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو جن چیزوں سے بہرہ مند کر رکھا ہے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور نہ ان کی حالت پر غم کرو اور اپنی شفقت کے بازو اہل ایمان کے لئے جھکائے رکھو۔

یہ آیت اس حقیقت کی ایک نہایت واضح شہادت ہے کہ قرآن مجید اور اس کی آیات کے اندر جو قوت چھپی ہوئی ہے وہ دنیا کے سروسامان اور اس کی فوجوں اور اس کے لشکروں

---

(۱) : طٰہٰ: ۱۱۴

(۲) الحجر: ۸۵-۸۸

کے اندر نہیں ہے۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ مذکورہ بالا آیات کے اسرار پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

انک ان تنصر بھذا الجند الروحانی باکثر مما ترجو من اولی القوۃ و الشوکۃ فاصبر علیٰ صلوتک وقراۃ المثانی و استعن بالمصلین معک و اعرض عن المشرکین المتولین عنک. (۱)

اللہ تعالیٰ پیغمبر صلعم سے فرماتا ہے کہ اس روحانی فوج کے ذریعہ تم کو اس سے زیادہ مدد ونصرت حاصل ہوگی جتنی قوت و شوکت والوں سے توقع ہے، پس نماز اور قراۃ مثانی پر ثابت قدم رہو اور جو نمازی مسلمان تمہارے ساتھ ہیں ان کو لے کر مشرکین اور اعراض کرنے والوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ خود پیغمبر جس کی فطرت علم و عمل کی مافوق العادت قوتوں اور قابلیتوں کا خزانہ ہوتی ہے، اپنے تزکیہ کے لئے ان آیات کا محتاج ہوتا ہے۔ ان کی رہنمائی سے وہ راہ یاب ہوتا ہے، ان کی روشنی اس کے سینہ کو کھولتی ہے اور اس کے دل کو منور کرتی ہے۔ ان کے عشق میں وہ بے تابانہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۲) کا وظیفہ پڑھتا ہے اور ان کو پاتے وقت اسکی بے قراری، اس کی بے خودی اور اس کے شوق عجلت کا یہ حال ہوتا ہے کہ معلم غیب کی زبان سے اس کو لا تعجل بالقرآن (۳) کا محبت آمیز عتاب سننا پڑتا ہے۔

جس قرآن عظیم کی آیات کا یہ رتبہ ہو، اس کی نسبت یہ بدگمانی کر لینا کہ وہ محض چند

(۱) اس حاشیہ کا حوالہ نہ مل سکا۔ ہاں دوسرے حاشیہ میں ان آیات کے تحت یہ حاشیہ ہے۔
"إن أعطاء ک ھذا القرآن وعد منصرک فلا تلتفت الی أصحاب العدة والعدد ولا تحزن علیھم لأنھم غیر جدیرین بالھدایة" ترجمہ: تمہیں قرآن دیا جانا تمہاری مدد کا وعدہ ہے۔ سو تم سامان اور تعداد والوں کی طرف نہ دیکھو اور نہ ان پر رحم کھاؤ کیونکہ وہ ہدایت کے لائق نہیں۔

(۲) طٰہٰ: ۱۱۴

(۳) أیضاً: ۱۱۴ اور سورہ القیامہ میں "لاتعجل بہ" آیا ہے۔

قوانین اور وعظوں اور چند قصوں کا ایک منتشر مجموعہ ہے، جس کو سمجھنے کے لئے نہ تفکر و تدبر کی ضرورت ہے اور نہ دوسرے وسائل واسباب سے کسی قسم کی مدد حاصل کرنے کی۔ کس قدر افسوسناک غلط فہمی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ پیغمبر پہلے تلاوت آیات کے ذریعہ نفوس کا تزکیہ کرتا ہے، فطرت کے مدفون خزانوں کو ابھارتا ہے، اٹے ہوئے چشموں کو جاری کرتا ہے، دبی ہوئی صلاحیتوں کو نمایاں کرتا ہے، اور چونکہ فساد علم کی جڑ شرک اور فساد عمل کی جڑ انکار معاد ہے، اس لئے سب سے پہلے توحید و معاد کی تعلیم کو دلوں میں راسخ کرتا ہے اور جب ان سے فارغ ہو چکتا ہے، تعلیم کتاب کا باب شروع کرتا ہے۔

## تعلیم کتاب:

تعلیم کتاب میں کتاب سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ قرآن مجید، لیکن آیات کا حصہ اوپر مذکور ہو چکا ہے اور حکمت کا ذکر مستقلاً علیحدہ آ رہا ہے اس وجہ سے اس سے کل قرآن مراد نہیں ہوسکتا، اس کا صرف وہ حصہ ہوسکتا ہے جو احکام و قوانین سے متعلق ہے۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ لفظ آیت کی طرح لفظ کتاب بھی قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جن میں سے بعض مشہور معانی یہ ہیں:

۱۔ کتاب آسمانی جو انبیاء پر نازل ہوئی۔ مثلاً ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (۱) (یہ کتاب الٰہی ہے اسکے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔)

۲۔ اللہ تعالیٰ کا قرارداد فیصلہ اور اجل معین مثلاً وَمَا اَھْلَکْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ اِلَّا وَلَھَا کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (۲) (اور ہم نے جس قوم کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لئے ایک معین نوشتہ رہا ہے)

(۱) البقرۃ: ۲

(۲) الحجر: ۴

۳۔ شرائع وقوانین مثلاً لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَه‘ (۱) (اور عقد نکاح کا عزم اس وقت تک نہ کرو جب تک قانون اپنی مدت کو نہ پہنچ جائے)۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کے قرارداده فیصلوں کا دفتر۔ مثلاً وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۲) (اور نہ کوئی تر اور خشک چیز ہے مگر وہ ایک روشن کتاب میں مندرج ہے)

۵۔ اعمال نامے، مثلاً فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَه‘ بِيَمِيْنِه (۳) (جس کو دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ اس کے دہنے ہاتھ میں)

آیت زیر بحث میں ہمارا خیال ہے، کتاب کا لفظ احکام وقوانین کے لئے آیا ہے، قرآن مجید میں اس معنی کے لئے اس لفظ کا استعمال مشہور ہے، چنانچہ سورہ بقرہ میں، جہاں سے احکام وقوانین کا باب شروع ہوتا ہے، اکثر احکام کتب یا کتب کے لفظ سے بیان ہوئے ہیں، كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى. (۴) (تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض ٹہرایا گیا ہے) كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ الآية(۵). (اور جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہونچے تو تم پر فرض کیا گیا ہے) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ. (۶) (تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے۔) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ(۷) (تم پر کفار سے جنگ فرض کی گئی ہے۔) وغیرہ۔ پھر متعدد جگہ صریح طور پر کتاب سے قانون مشروع مراد لیا ہے۔ مثلاً وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَه‘(۸) اس آیت میں کتاب سے مراد قانون عدت ہے۔ سورہ احزاب میں ہے وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ

(۱) البقرة:۲۳۵ (۲) الانعام :۵۹
(۳) الحاقه :۱۹ (۴) البقرة : ۱۷۸
(۵) أيضاً :۱۸ (۶) أيضاً : ۱۸۳
(۷) أيضاً :۲۱۶ (۸) أيضاً : ۲۳۵

فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ(١) اس آیت میں کتاب سے قانون وراثت مراد ہے۔

الغرض کتاب کالفظ قرآن مجید میں شرائع اور قوانین کے لئے معروف ہے۔اور چونکہ آیت زیر بحث میں قرآن مجید کے اجزائے ترکیبی کی تحلیل کر کے بتایا گیا ہے کہ اس میں کیا کیا عناصر ہیں اس وجہ سے موقع و محل کا تقاضا اور قرینہ کی شہادت یہی ہے کہ یہاں کتاب سے شرائع وقوانین کا حصہ مراد لیا جائے۔

اس تفصیل سے تعلیم الٰہی کی یہ حکمت روشن ہوتی ہے کہ اس نے ہماری فطرت کے تقاضوں کو کس قدر ملحوظ رکھا ہے کہ جب تک دلائل کے ذریعہ سے ہم کو تمام غیر فطری آلودگیوں سے پاک نہ کرلیا، اس وقت تک قوانین کی اطاعت کی ذمہ داری ہم پر نہیں ڈالی۔

فطرت کی مثال معدہ کی ہے.جس طرح معدہ خراب غذاؤں کے استعمال اور فضلات کے جمع ہو جانے سے اپنی اشتہا کھو بیٹھتا ہے اور پھر کسی لذیذ سے لذیذ غذا کے لئے بھی اپنے اندر کوئی رغبت نہیں پاتا اسی طرح فطرت بھی اوہام وخرافات کے غلبہ سے اپنی خواہش ارتقاء کھو بیٹھتی ہے اور پھر کسی عمل صالح کے لئے بھی مستعد نہیں ہوتی ۔ایسی حالت میں ضروری ہوتا ہے کہ جس طرح طبیب جسمانی پہلے معدہ کو خراب فضلات سے پاک کر کے اس کی اشتہاء کو اصلی حالت پر لانے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح طبیب روحانی بھی پہلے فطرت کو اس کی آلودگیوں سے صاف کر کے اس کی اصلی بھوک کو مشتعل کرے۔اس کے مشتعل ہو جانے کے بعد شریعت اور دین کی ہر بات کے لئے وہ اسی طرح بے تاب اور مضطرب ہوگی جس طرح ایک پیاسا پانی کے لئے اور ایک بھوکا غذا کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔قرآن مجید نے اس حالت کی تصویر یوں کھینچی ہے:۔

| | |
|---|---|
| رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیاً یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ | اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے |
| اَنْ آمِنُوا بِرَبِّکُم فَآمَنَّا رَبَّنَا | والے کو سنا ایمان کی دعوت دیتے کہ لوگو، |

(١) الاحزاب :٦

فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الأبْرَارِ (۱)

اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں موت اپنے وفادار بندوں کے ساتھ دے۔

اس تفصیل سے دو اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔

ا۔تمام شریعت کا سر چشمہ فطرت کے چند بنیادی حقائق ہیں۔جس طرح ایک سے سو اور ہزار وجود میں آتے ہیں اسی طرح چند بنیادی حقائق کے لوازم ونتائج کے طور پر دین کا سارا عملی واعتقادی نظام وجود میں آتا ہے۔اسی وجہ سے اسلام کو دین فطرت کہا گیا ہے۔

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ. ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲)

اس دین فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے ۔یہی سیدھا دین ہے ۔لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا العلم. (۳)

کھلی ہوئی دلیلیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا۔

فطرت کی یقینیات اور اسلام کے عملی نظام میں یہ لزوم اس قدر نمایاں ہے کہ جس طرح اقلیدس کے اصول موضوعہ کے بعد ان کے نتائج سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ان یقینیات کو تسلیم کرنے کے بعد مذہب کی تعلیمات سے انکار ناممکن ہے ۔ایسے ہی مسلمات اور یقینیات سے جب قرآن مجید نتائج نکالتا ہے اور ان لوگوں کے سامنے پیش

(۱) آل عمران: ۱۹۳

(۲) الروم : ۳۰

(۳) العنکبوت: ۴۹

کرتا ہے اور لوگ ان کو نہیں مانتے تو کہا جاتا ہے کَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ (۱) (کیسا فیصلہ کرتے ہو ؟) فَاَنّٰى تُؤۡفَكُوۡنَ (۲) (کہاں بھٹکے جارہے ہو؟)۔

۲۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ شرائع واحکام حقیقت میں تزکیہ کے جزئیات ہیں یہ تزکیہ کو کامل اور روشن کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت سے ایمان پیدا ہوتا ہے اور عمل کے ذریعہ سے بندہ اس ایمان کو بڑھاتا ہے۔ یہ فطرت کا عام قانون ہے کہ علم، عمل ہی کے ذریعہ سے پختہ اور راسخ ہوتا ہے۔ ایک کسان سے لے کر ایک سائنس داں تک سب عمل ہی کے ذریعہ سے اپنے علم کو فروغ دیتے ہیں۔ دین کی سیر باطن میں بھی فطرت کا یہی قانون جاری ہے۔

پس شرائع کا اصلی مقصد تزکیہ اور ایمان وتقویٰ کی روشنی کو بڑھانا ہے چنانچہ نماز کی نسبت فرمایا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ (۳) (نماز بے حیائی اور منکر سے روکتی ہے) زکوٰۃ کے متعلق فرمایا ہے۔ يُؤۡتِىۡ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۴) (وہ اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے دیتا ہے) روزہ کی بابت فرمایا ہے لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ (۵) (تاکہ تم تقویٰ اور پرہیزگاری حاصل کرو)

قربانی کی نسبت فرمایا ہے۔ لَنۡ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوۡمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنۡ يَّنَالُهُ التَّقۡوٰى مِنۡكُمۡ (۶) (اور اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون۔ بلکہ اس کو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے) اگر شرائع اور قوانین اس مقصد سے محروم ہو جائیں یعنی ان سے تزکیہ اور تقویٰ نہ حاصل ہو سکے اور ایمان کی روشنی نہ بڑھے تو پھر یہ بالکل بے سود ہو جاتے ہیں۔ ایسی نماز، ایسے روزے اور ایسے حج کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قدر نہیں ہے۔

(۱) الصفت : ۱۵۴ (۲) فاطر : ۳
(۳) العنکبوت : ۴۵ (۴) اللیل : ۱۸
(۵) البقرة : ۱۸۳ (۶) الحج : ۳۷

علم گر بر تن زنی مارے بود
علم گر بر دل زنی یارے بود

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں احکام وقوانین کا بیان اس طرح نہیں ہوتا جس طرح فقہ وقانون کی عام کتابوں میں ہوتا ہے، قرآن ہر حکم کے آگے پیچھے خدا کی صفتوں اور آخرت کی بار بار یاددہانی کراتا ہے اور اس کے روحانی واخلاقی نتائج اور اجتماعی وتمدنی فوائد ایسے دلنشیں انداز میں پیش کئے جاتے ہیں کہ دل پر ان احکام کا اثر پڑتا ہے۔ فقہ کی کوئی کتاب پڑھیے تو قلب پر کوئی اثر طاری نہ ہوگا لیکن انہی باتوں کو اگر قرآن مجید میں تدبر کے ساتھ پڑھئے تو روح کا گوشہ گوشہ انکی عظمت کے احساس اور ان کی تکمیل کے جذبہ سے معمور ہو جائے گا۔ جو بات قانون کی کتابوں میں ایک شاخ بریدہ نظر آتی ہے وہی بات قرآن مجید میں ایک سرورعنا کی طرح نظر آئے گی۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ ہر شخص جس نے قرآن کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ قرآن فقہی احکام کو ہمیشہ دین کی اصولی تعلیمات کے ساتھ ملا کر بیان کرتا ہے وہ کبھی تو فروع سے اصول کی طرف بڑھتا ہے، جس کی مثال سورہ احزاب وغیرہ میں ملتی ہے۔ کبھی اصول سے فروع کی طرف اترتا ہے، جس کی مثال سورہ جمعہ میں موجود ہے، اور کبھی اصول کو اجزاء وفروع کے درمیان ایک آفتاب تاباں کی طرح رکھ دیتا ہے۔ جس کی بہترین مثال سورہ نور میں موجود ہے۔

## تعلیم حکمت:

تیسری چیز تعلیم حکمت ہے۔ حکمت کے متعلق ایک نہایت ہی اہم سوال یہ ہے کہ حکمت قرآن ہی کا ایک جز ہے یا اس سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کتاب الٰہی جس طرح آیات اللہ اور احکام پر مشتمل ہے اسی طرح حکمت پر بھی مشتمل ہے لیکن ہمارا یہ دعویٰ ان لوگوں کے خیال کے خلاف پڑے گا جو حکمت سے حدیث یا بعض دوسرے علوم مراد لیتے ہیں اور چونکہ یہ مذہب بعض اکابرامت مثلاً امام شافعیؒ وغیرہ کا بھی ہے، اس وجہ سے

اس کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ لہذا دیکھنا چاہئے کہ جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں ان کی دلیل کیا ہے؟

ان کی دلیل یہ ہے کہ حکمت کا لفظ مندرجہ صدر آیت میں کتاب کے لفظ کے ساتھ آیا ہے۔ کتاب سے یہ لوگ قرآن مجید، باعتبار مجموعی مراد لیتے ہیں اس لئے ضروری ہوا کہ حکمت سے کوئی اور چیز مراد لیں اور قرآن کے بعد ظاہر ہے کہ حدیث کے سوا کوئی دوسری چیز اس لفظ کا مدلول نہیں بن سکتی۔

لیکن اوپر کے مباحث سے یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ یہ استدلال کچھ مضبوط نہیں ہے۔ آیت مذکورہ میں، جیسا کہ ہم نے تشریح کی ہے، کتاب سے مراد احکام وقوانین ہیں۔ اس لئے حکمت کے لئے خود قرآن میں کافی گنجائش ہے۔ اس سے حدیث یا قرآن سے خارج کسی اور شئے کو مراد لینا کچھ ضروری نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ حدیث میں بھی حکمت ہے۔ حدیث کا رتبہ بہت بلند ہے۔ وہ امت کے لئے قرآن کے بعد دوسری چیز ہے۔ اس میں خود حکمت قرآن کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ پھر اگر حدیث میں حکمت نہ ہوگی تو کہاں ہوگی؟ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اس آیت میں حکمت سے مراد حدیث ہے۔ مختلف وجوہ اور قرائن اس کے خلاف ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ متعدد آیات میں حکمت کے لئے یُتْلٰی، اَنْزَلَ اور اَوْحٰی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کا استعمال حدیث کے لئے قرآن میں کہیں نہیں ہوا ہے مثلاً:

| | |
|---|---|
| وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (۱) | اور اللہ نے تم پر کتاب وحکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے۔ |

اور دوسری جگہ ہے:

(۱) النساء: ۱۱۳

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ.(۱) تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا چرچا کرو۔

ایک اور مقام پر دین کی اصولی باتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

ذٰلِكَ مِمَّا اَوْحىٰ اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ.(۲) یہ ان باتوں میں سے ہیں جو تمہارے رب نے حکمت میں سے تمہاری طرف وحی کی ہیں۔

۲۔ مختلف مواقع پر قرآن مجید کے دلائل و براہین کو حکمت بالغۃ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور خود قرآن کو قرآن حکیم اور کتاب حکیم وغیرہ کہا گیا ہے۔ مثلاً حکمة بالغة (۳) (نہایت دلنشیں حکمت) یٰس وَ الْقُرْآنِ الْحَكِيْمِ .(۴) (شاہد ہے پر حکمت قرآن)

۳۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰاةَ وَ الْاِنْجِيْلَ.(۵) یاد کرو جبکہ میں نے تمہیں کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کی تعلیم دی۔

اس آیت میں کتاب اور حکمت کے الفاظ کے بعد تورات وانجیل کے الفاظ بطور تشریح آئے ہیں۔ لفظ کتاب کی تشریح توریت ہے۔ اور حکمت کی تشریح انجیل کے لفظ سے کی گئی ہے، اہل علم جانتے ہیں کہ تورات زیادہ تر احکام وقوانین پر مشتمل ہے اور انجیل دلائل ونصائح کا ایک مجموعہ ہے۔ مقدم الذکر میں دلائل ونصائح کا حصہ بہت کم ہے اور موخر الذکر میں احکام وشرائع برائے نام ہیں۔ احکام وقوانین کے بارہ میں انجیل، تورات کی تصدیق کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتی ہے۔ تورات کی اسی قانونی اہمیت کی وجہ سے اس کو کتاب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور انجیل کو اسکی حکمتوں اور نصیحتوں کی وجہ سے حکمت کہا گیا ہے۔

بعض دوسری آیات سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

(۱) الاحزاب : ۳۴ (۲) بنی اسرائیل: ۳۹
(۳) القمر :۵ (۴) یس :۲
(۵) المائدہ :۱۱۰

وَلَمَّا جَاءَ عِیسیٰ بِالبَیِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئتُکُم بِالحِکْمَةِ وَ لِاُبَیِّنَ لَکُم بَعْضَ الَّذِیْ تَختَلِفُونَ فِیہِ .(۱)

جب عیسیٰ کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو اس نے دعوت دی کہ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور تا کہ میں تم پر واضح کردوں بعض وہ باتیں جن میں تم نے اختلاف کیا ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر حکمت سے صرف حدیث کو مراد لینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے بلکہ حدیث حکمت میں شامل ہے۔ یہ غلط فہمی کتاب اور حکمت، دونوں لفظوں کے اکٹھے ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن ہم نے جو پہلو واضح کئے ہیں ان کی روشنی میں دونوں کے حدود الگ الگ ہو جاتے ہیں جس کے بعد یہ غلط فہمی باقی نہیں رہتی۔

## لفظ حکمت کی لغوی تحقیق:

اب اجمالا لفظ حکمت کو لغت اور اس کے استعمالات کی روشنی میں بھی دیکھ لینا چاہیے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے مفردات القرآن میں اس لفظ پر مفصل بحث کی ہے ذیل میں اس کا ضروری خلاصہ نقل کیا ہے:

الحکم فعل للقضاء المطلق حقا او باطلا قال اللہ تعالیٰ "مَالَکُم کَیفَ تَحکُمُونَ (۲)" ایضا "اَفَحُکمَ الجَاهِلِیَّةِ یَبغُونَ" (۳) ویطلق علیٰ القوة التی ھی منشأ القضاء و حینئذ یراد بہ الفھم

لغت میں حکم کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں عام اس سے کہ حق ہو یا باطل۔ قرآن میں ہے ما لکم الخ تمہیں کیا ہو گیا ہے! تم کیسا فیصلہ کرتے ہو۔ نیز فرمایا افحکم الخ کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ پھر یہ لفظ اس قوت کے

(۱) الزخرف: ۶۳
(۲) القلم : ۳۶
(۳) المائدة : ۵۰

سیاتیک شواهده و ام الحکمة فی
اسم للقوة التی منها ینشاء القضاء
بالحق قال تعالیٰ فی
نعت داؤد اٰتَیْنَاهُ الْحِکْمَةَ وَ فَصْلَ
الْخِطَابِ(۳) فذکر الاثر بعد القوة التی
هی مصدر تلک الاثر و کما ان
القول الفصل من آثار الحکمة
فکذلک طهارة الخلق وحسن الادب
من اثارها ولذلک کانت
العرب تطلق اسم الحکمة علیٰ قوة
جامعة لرزانة العقل و الرای و
شرافة الخلق الناشئة منها فسموا
الرجل العاقل المهذب حکیما و
کذلک یطلقون اسم الحکمة علیٰ
فصل الخطاب وهو القول الحق
الواضح عند العقل و القلب و کل
هذه الوجوه من معانی الحکمة جاء
فی کلام العرب و استعملها القرآن
والنبی بما عرفوه قال النبیؐ ان من
الشعر لحکمة ای لیس کل شعر

لئے بولا جاتا ہے جس کی روشنی سے یہ فیصلہ
صادر ہوتا ہے اور اس وقت اس سے فہم مراد
ہوتی ہے اس کے شواہد آگے آئیں گے ۔
رہا لفظ حکمت تو اس قوت کے لئے
بولا جاتا ہے جو صحیح فیصلہ کا سرچشمہ
ہے ۔ حضرت داؤدؑ کی تعریف میں فرمایا
گیا آتیناہ الخ ’’ہم نے اس کو حکمت دی
اور فیصلہ کن بات کرنے کی لیاقت‘‘ ۔ یہاں
اثر کو اس قوت کے بعد بیان کیا گیا ہے جو اس
اثر کا سرچشمہ ہے ۔اور جس طرح فیصلہ
معاملات حکمت کے اثرات میں سے ہے اسی
طرح اخلاق کی پاکیزگی اور حسن ادب بھی
اس کے اثرات میں سے ہے ۔اسی لئے اہل
عرب اس لفظ کو اس قوت کے لئے استعمال
کرتے تھے جو عقل و رائے کی پختگی اور
شرافت اخلاق دونوں کی جامع ہو اور عاقل و
مہذب آدمی کو حکیم کہتے تھے ۔اسی طرح لفظ
حکمت کو فصل الخطاب کے لئے بولتے تھے
جس سے مقصود ایسی پکی بات ہے جو عقل اور
دل دونوں کے نزدیک واضح ہو ۔حکمت ان

(۱) ص : ۲۰

غواية بل منه ما يتضمن علىٰ الحق و الحث علىٰ الخير .هذا. ثم استعملها الله تعالىٰ فى اكمل افرادها فسمى الوحى حكمة كما سماه نورا و برهانا و ذكرا و رحمة و من هذه الجهة سمى القرآن حكيما اى ذا حكمة كما سمى نفسه حكيما و علمياً ..................(۱)

تمام معانی کے لئے کلام عرب میں مستعمل ہے اور چونکہ اہل عرب لفظ نے ان تمام پہلوؤں سے پورے طور پر باخبر تھے اس لئے قرآن اور پیغمبرؑ نے اس کو استعمال کیا۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے۔شعروں میں سے بعض حکمت ہیں یعنی ہر شعر گمراہی نہیں ہے، کچھ شعر ایسے بھی ہیں جن میں حق بات کہی گئی ہے اور جن میں بھلائی پر ابھارا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کے اعلیٰ ترین مفہوم کے لئے استعمال کیا یعنی وحی کے لئے۔ وحی کو جس طرح نور، برہان، ذکر رحمت وغیرہ کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے، اسی طرح حکمت کے لفظ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اور اس پہلو سے قرآن مجید کا نام حکیم رکھا۔ جس طرح اپنی ذات کے لئے حکیم وعلیم کے لفظ استعمال کئے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ حکمت، کلام اور متکلم دونوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی حقیقت وہ استحکام اور پختگی ہے جو دانش مندی پر مبنی ہو۔ جس طرح آگ حرارت سے معلوم کی جاتی ہے اسی طرح حکمت اپنے اثرات سے پہچانی جاتی ہے جب یہ کسی شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر حق شناسی کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان سے جو بات نکلتی ہے حق نکلتی ہے اور اس سے جو فعل بھی صادر ہوتا ہے، ٹھیک صادر ہوتا

(۱) مفردات القرآن: ۳۴-۳۵

ہے۔قرآن مجید میں لقمان (۱) کے قصہ میں اسکے اثرات بیان کئے گئے ہیں۔یہی چیز خدا کی آنکھ اور خدا کا ہاتھ ہے جو اس سے دیکھتا ہے اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔وہ تنگ و تاریک راہوں میں بھی لغزشوں اور ٹھوکروں سے محفوظ رہتا ہے۔وہ قطروں میں سمندر کا مشاہدہ کرتا ہے۔اس وجہ سے شریعت کی رائی کو بھی پربت سمجھتا ہے۔جو چیز دوسروں کے نزدیک سنگریزے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی وہ اس کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتا ہے۔

اسی طرح جب یہ کسی کلام میں پائی جاتی ہے تو وہ کلام عقل کی راہ سے دل میں اتر جاتا ہے۔وہ ہر وسوسہ کو مٹا دیتا ہے، ہر شبہ کو دھو دیتا ہے ہر دعویٰ کو باطل کر دیتا ہے، ہر جھوٹی منطق کو منہدم کر دیتا ہے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَھَقَ البَاطِلُ اِنَّ البَاطِلَ کَانَ زَھُوقاً۔(۲)

حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا اور باطل نابود ہونے والی چیز ہے۔

اور یہی قرآن مجید کی خصوصیت ہے۔

## ایک ضروری نکتہ:

اس موقع پر، حکمت کی عظمت و اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے ایک ضروری نکتہ بھی سمجھ لیجئے جس سے ضمناً توراۃ اور قرآن مجید کا باہمی فرق بھی نمایاں ہو جائے گا۔

قرآن مجید میں تورات کی جو صفات و خصوصیات بیان ہوئی ہیں ان میں کہیں حکمت کا ذکر نہیں آیا ہے۔بلکہ یہ بعض مواقع میں صاف تصریح ہے کہ تورات قانون سے انجیل حکمت، البتہ کہیں کہیں اس کا موعظت پر مشتمل ہونا بیان کیا گیا ہے۔مثلاً

وَ کَتَبْنَا لَہٗ فِی الاَلْوَاحِ مِن کُلِّ شَیئٍ

ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی

(۱) دیکھیں آیات:۱۲-۱۳ اور ۱۶-۱۹

(۲) بنی اسرائیل : ۸۱

مَوْعِظَةً وَّ تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ. (۱)     نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔

اب سوال یہ ہے کہ موعظت کیا ہے؟ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے موعظت حکمت کی ایک شاخ ہے۔ عین حکمت نہیں ہے۔ حکمت موعظت سے بہت بلند چیز ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انہی اشخاص یا انہیں جماعتوں کو ملتی ہے جو عقل کی پوری پختگی کو پہنچ گئے ہوں۔ جب تک کوئی قوم ذہنی اعتبار سے عہد طفولیت میں ہوتی ہے، اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس کو حکمت سے نہیں سرفراز فرماتا۔ بلکہ زندگی کو ٹھیک طور پر بسر کرنے کے لئے اس کو ایک ضابطہ شریعت عنایت فرماتا ہے اور فکر ونظر کی معمولی لغزشوں سے بچنے کے لئے اس کو بقدر فہم واستعداد وموعظت بخشی جاتی ہے۔ سورہ اعراف میں اس حقیقت کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر پہنچے انہوں نے خدا کو دیکھنے کی خواہش کی، اللہ تعالیٰ نے جواب دیا تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، میرے جلوہ کی تاب تو پہاڑ بھی نہیں لاسکتا چہ جائیکہ انسان کا دل۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی پہاڑ پاش پاش ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام غش ہوگئے پھر جب ہوش میں آئے تو انہوں نے فوراً توبہ کی۔

سُبْحَانَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ. (۲)     اے میرے رب تو پاک ہے، اب میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَا مُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِي وَبِكَلَامِي وَخُذْ مَا آتَيْتُكَ وَ     اے موسیٰ! میں نے تم کو لوگوں پر اپنے پیغام اور اپنے کلام سے سرفراز کیا تو میں نے جو

(۱) الاعراف: ۱۴۵

(۲) أيضا: ۱۴۳

كُنُ مِّنَ الشَّاكِرِينَ. (۱) کچھ تم کو دیا اس کو لو اور شکر گزاروں میں سے ہو

ان الفاظ پر غور کیجئے۔ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کمال معرفت کی تمنا کی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمنا نہ کرو۔ کمال معرفت کا بوجھ کوہ وجبل بھی نہیں سہار سکتے۔ تم کیسے سہار سکو گے؟ جتنا ملا ہے اس پر قناعت کرو اور خدا کے شکر گزار رہو۔

یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کامل حکمت کی مستحق نہیں ٹھہری۔ اس کو صرف قانون اور موعظت دی گئی اس لئے کہ اس کی ذہنی اور قلبی استعداد اس سے زیادہ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو انبیاء آئے انہوں نے آہستہ آہستہ بنی اسرائیل کو کسی قدر حکمت سے آشنا کرنا چاہا لیکن انہوں نے اس کی قدر نہیں کی۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے جن کو اللہ تعالیٰ نے صحیفہ حکمت عنایت فرمایا تھا لیکن جیسا کہ خود ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک بھی بنی اسرائیل کی ذہنی استعداد کامل حکمت کے تحمل کے لائق نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ ''مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی تھیں لیکن تم ان سب کا تحمل نہ کر سکو گے'' (۲) اور کامل حکمت کی تعلیم کا معاملہ اپنے بعد آنے والے پر چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

یہ بعد میں آنے والا جب آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک ایسی کتاب سے سرفراز فرمایا جو توراۃ کی طرح صرف قانون ہی نہیں ہے بلکہ انجیل کی طرح اس میں حکمت وموعظت بھی ہے۔ اور حکمت کو وہ حصہ بھی اس میں ہے جس کی تعلیم حضرت مسیح نے قوم کی عدم صلاحیت کی وجہ سے ملتوی کر دی تھی۔ کتاب اور حکمت کا یہی مجموعہ ہے جس کو ہم قرآن کے نام سے جانتے ہیں چونکہ یہ کامل حکمت سے معمور ہے اس وجہ سے اس میں کمال عرفان کی

(۱) الاعراف :۱۴۴

(۲) انجیل یوحنا۔باب:۱۶:۱۲

وہ تمام بجلیاں بند ہیں جن کی ایک ادنیٰ نمود نے طور کو پاش پاش اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بے ہوش کر دیا تھا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی رحمت مقتضی ہوئی اس نے ایک ایسے انسان کو پیدا کر دیا جس نے وہ بوجھ اٹھا لیا جو طور نہ برداشت کر سکا تھا۔ سورہ حشر کی یہ آیت قرآن حکیم کی اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

| | |
|---|---|
| لَو اَنزَلنَا هٰذَا القُرآنَ عَلیٰ جَبَلٍ لَرَأیتَهٗ خَاشِعاً مُتَصَدِّعاً مِن خِشیَةِ اللّٰهِ .(۱) | اگر اس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ خشیت الٰہی سے پست اور پاش پاش ہو جاتا۔ |

یہی راز ہے کہ توراۃ کا بیک دفعہ نازل ہونا تو ممکن ہوا لیکن قران حکیم بیک دفعہ نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا نازل ہوا تا کہ قلب انسانی تدریجی تربیت کے ذریعہ سے آہستہ آہستہ ان بجلیوں کو برداشت کرنے کے قابل ہو جائے اور ان کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ کفار و مشرکین، یہود کے اشارہ سے، آنحضرت صلعم پر اعتراض کرتے تھے کہ قرآن مجید توراۃ کی طرح پورا کا پورا ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل ہو جاتا، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کَذٰلِکَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَکَ (۲) (ایسا اس لئے ہوا تا کہ اس کے تحمل کیلئے ہم تمہارے قلب کو مضبوط کر دیں)۔ غور کیجئے کہ جو مقدس سینہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (۳) کے انوار سے معمور تھا اس کے لئے بھی قرآن کا تحمل کچھ آسان نہ تھا، پھر عام لوگوں کا کیا حال ہوتا جن کی استعداد اور نبی کی استعداد میں آسمان و زمین کا فرق تھا۔

یہ ایک طویل داستان تھی جس کی طرف چند لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حکمت کی عظمت و اہمیت کا کیا حال ہے؟ قرآن مجید میں اس کا مقام کیا ہے؟ اور اس کے لئے فکر و نظر اور قلب و دماغ کی کیا کیا صلاحیتیں درکار ہیں۔

---

(۱) الحشر : ۲۱ (۲) الفرقان : ۳۲
(۳) ألم نشرح : ۱

## قرآن مجید محل تدبر ہے:

اس تمام تفصیل کا خلاصہ یہ نکلا کہ قرآن مجید کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ محض احکام وقوانین کا مجموعہ ہے اور کلام کے اس صنف میں داخل ہے جس کو سمجھنے کے لئے کسی خاص ذہنی کاوش اور فکر و تدبر کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص جو عربی عبارتوں کا الٹا سیدھا ترجمہ کرسکتا ہے، قرآن مجید کی تاویل وتفسیر بھی کرسکتا ہے، بلاشبہ وہ عام تعلیم کے اعتبار سے، نہایت کھلا ہوا اور آسان ہے، ہر شخص بقدر استعداد اس سے فیض حاصل کرسکتا ہے۔ زندگی کو جس روش پر گزارنا چاہے اس کی طرف پہلی ہی نظر میں، اشارہ کردیتا ہے۔ کرنے کی تمام باتیں اور بچنے کی تمام چیزیں بغیر کسی اینچ پیچ کے نہایت واضح لفظون میں بتادیت ہے۔ حرام وحلال کے تمام حدود بالکل متعین الفاظ اور نپے تلے جملوں میں، مقرر کردیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے اندر ایک عمیق فلسفہ اور گہری حکمت بھی رکھتا ہے، جس کا گہراؤ اتھاہ اور جس کی وسعت ناپیدا کنار ہے۔ اس کے لئے صرف عربی زبان دانی ہی کافی نہیں ہے بلکہ تدبر کی بھی ضرورت ہے۔ صرف پیرنا ہی کافی نہیں بلکہ ڈوبنا بھی پڑتا ہے۔ راہ چلتوں کی طرح صرف گزر ہی نہیں جانا چاہیے بلکہ لفظ لفظ پر رک کر ایک ایک گوشہ کی تفتیش کرنی چاہیے۔ پھر ایسا صرف ایک بار نہیں بلکہ جیسا کہ احادیث میں وارد ہے، بار بار کرنا چاہیے۔ یہ پیہم مطالعہ اور مسلسل غور وفکر کی چیز ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| تعاھدوا ھذا القرآن فو الذی نفس محمد بیدہ لھو اشد تفلتا من الابل عن عقلھا (١) | اس قرآن کی برابر نگہداشت کرو اس لئے کہ اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے یہ اپنے بندھن سے نکل بھاگنے والے اونٹ سے کہیں زیادہ سبک رو ہے۔ |

یہی وجہ تھی کہ اس کے اسرار وحقائق پر غور کرنے کے لئے ذہین صحابہ کے حلقے قائم تھے

(١) صحیح مسلم، کتاب الذکر ٣٨، ابوداود، کتاب الوتر: ١٤، صحیح الترمذی، کتاب القرآن: ١٠

اور آنخضرت صلعم ایسے حلقوں کے قیام کے لئے موثر الفاظ میں لوگوں کو شوق دلایا کرتے تھے۔ ابوداؤد میں روایت ہے۔

| | |
|---|---|
| ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت الله یتلون کتب الله ویتدارسونه بینهم الا نزلت علیهم السکینة و غشیتهم الرحمة و حفتهم الملئکة و ذکرهم الله فیمن عنده (۱) | جولوگ کسی جگہ جمع ہوکر اللہ کی کتاب پڑھتے اور باہم درس و مذاکرہ قرآن کی مجلسیں قائم کرتے ہیں، ان پر اللہ کی طرف سے تسکین اور رحمت کی بارش ہوتی ہے اور ملائکہ انکو ہر طرف سے گھیرے کھڑے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کے حلقہ میں ان کا ذکر فرماتا ہے۔ |

اس حدیث سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ اس طرح کی مجالس کے قیام میں بڑی برکت ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اس چیز کا بڑا چرچا تھا۔ اس زمانہ میں قرآن مجید کے مذاکرہ و مطالعہ کی یہ مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، صحابہؓ ان میں شریک ہوتے تھے، آیات قرآن پر غور کرتے تھے، مشکلات میں ایک دوسرے کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ خود آنخضرت صلعم بھی کبھی کبھی ان مجالس میں شرکت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فکر و تدبر کی ان مجلسوں کو ذکر و عبادت کی مجلسوں پر ترجیح دی اور زاہدوں، عابدوں کی ایک مجلس کو چھوڑ کر اہل علم کی ایک مجلس میں یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

سوچنے کی بات ہے کہ آخر صحابہؓ کس چیز پر غور و تدبر کرتے تھے؟ زبان ان کی تھی، اس کے اسالیب و قواعد ان کے غور و بحث کی چیز نہ تھے؟ قرآن جن حالات و واقعات

(۱) أبوداؤد، کتاب الوتر باب: ۱۴، صحیح مسلم، کتاب المسافرین ۲۳۱، الدارمی، فضائل القرآن: ۴، مسند أحمد: ۲، ۱۴۶، ۱۵۰، ۱۵۳، ۲۹۷

پر اترتا تھا وہ تمام تر خود ان کے تھے، ان کے جاننے کے لئے ان کو کوئی کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی؟ تلمیحات واشارات کا تعلق ایسی باتوں سے تھا جن کی تفصیلات پر وہ روزانہ گفتگوئیں کرتے تھے؟ خیالات، عقائد، اعمال وافعال اور معروف ومنکر، جن پر قرآن بحث کرتا تھا، وہ سرتاسر خود انکی اپنی سرگزشت تھی، پچھلی قوموں کے حالات جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں وہ ان کے روزانہ کے چرچے تھے، یہود ونصاریٰ کے خیالات وعقائد یا حالات وواقعات جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے، ان سے بھی وہ گوناگوں تعلقات کی وجہ سے بخوبی باخبر تھے، پھر قرآن مجید میں ایسی کیا چیز تھی جس پر ان کو غور کرنا تھا؟ لیکن ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غور وتدبر کرتے تھے اور معمولی غور وتدبر نہیں بلکہ ایسا غور وتدبر جس کی مثالیں تحقیق وتنقید کے اس روشن عہد میں بھی زیادہ نہ مل سکیں گی۔ چنانچہ مؤطا میں ایک روایت ہے:

| | |
|---|---|
| ان عبد الله بن عمر مكث على سورة البقرة ثمانى سنين يتعلمها (۱) | حضرت عبد اللہ بن عمر مسلسل آٹھ برس تک سورہ بقرہ پر تدبر فرماتے رہے۔ |

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو ان تمام وادیوں میں سے کسی ایک وادی سے بھی گزرنا نہیں تھا، جن سے اب قرآن مجید کے ہر طالب علم کو گزرنا پڑتا ہے، ان کی راہ نہایت سیدھی اور صاف تھی، قرآن مجید کے فہم وتدبر کے لئے جن چیزوں کے ہم محتاج ہیں، ان میں سے اگر کل سے نہیں تو بیشتر سے وہ بالکل بے نیاز تھے۔ ان کے فکر ونظر کی چیز صرف قرآن کے اسرار وحکم تھے۔ ہمارے مروجہ علوم وفنون کی یہ تمام حصار بندیاں بھی ان کے اردگرد نہ تھیں، اس آسمان کے نیچے صرف ایک کتاب تھی جس کا علم وعمل اور جس کا درس ومطالعہ ان کی تمام زندگی اور زندگی کے تمام ولولوں اور حوصلوں کا مرکز تھا تاہم آپ نے دیکھا کہ وہ قرآن مجید کی ایک ایک سورہ پر آٹھ آٹھ برس تدبر فرماتے تھے۔ ان کو نہ تو قرآن مجید کی زبان سیکھنی تھی، نہ اس کے شان نزول اور اسکے ناسخ ومنسوخ کے جھگڑوں میں الجھنا تھا، زبان ان کی تھی، مذاق ان کا تھا، خیالات ان کے تھے، حالات ومعاملات اور عقائد واعمال سب ان کے

(۱) الموطأ: کتاب القرآن، باب: ۴

تھے ،تاہم ایک ایک سورہ پر آٹھ آٹھ سال تدبر کرنے کے بعد بھی وہ آسودہ نہیں ہوتے تھے۔پھر ہمارے لئے جو قرآن کی ہر چیز سے بیگانہ ہیں اور جن کو اس سے مانوس ہونے کے لئے صدہا چیزوں سے واقف ہونا پڑتا ہے یہ خیال کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید ایک نہایت کھلی ہوئی کتاب ہے جس کو سمجھنے کے لئے کسی خاص کاوش واہتمام کی ضرورت نہیں ہے؟

یہ صحابہ کرام کی زندگی کی کھلی ہوئی شہادتیں ہیں۔اس کے علاوہ خود قرآن مجید پر بھی نظر ڈالئے تو مشکل ہی سے کوئی سورہ ہوگی جو فکر ونظر اور تفکر وتدبر کی دعوت سے خالی ہو۔ ہر قدم پر لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ(۱) (تاکہ سمجھو) ہر چند آیات کے بعد لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ(۲) (تاکہ غور کرو) ہر تھوڑے تھوڑے فاصلہ کے بعد لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ(۳) (تاکہ یاددہانی حاصل کرو) کی دعوت بلند ہوتی ہے ۔سورہ ق میں قرآن مجید کے فہم کے لئے ضروری شرط یہ بتائی ہے کہ:

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ. (۴)

بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی یاددہانی ہے جن کے پاس دل ہو یا وہ بات سننے کے لئے کان لگائیں ،متوجہ ہوکر۔

یعنی قرآن مجید سے فائدہ اٹھانے کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ سینہ میں بیدار و ہشیار دل ہو جو فہم کا سرچشمہ ہے،اور اگر بیدار دل نہ ہوتو کم ازکم سننے والے کان ہوں، جو پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ قرآن مجید کی باتوں پر جم جائیں تاکہ قرآن ان کے راستہ سے دلوں تک اتر سکے۔اگر ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے،نہ دل کی ہوشیاری و بیداری ہی موجود ہے،نہ سماعت کی یکسوئی اور دلجمعی ہی پائی جاتی ہے تو ایسے شخص کے لئے قرآن سے

(۱) غافر : ۶۷ ، الزخرف: ۳، الحديد : ۱۷
(۲) البقرة : ۲۱۹، ۲۲۶
(۳) الأنعام : ۱۵۲ ، الأعراف: ۵۷، النحل : ۹
(۴) ق : ۳۷

فیض یاب ہونا ناممکن ہے۔ قرآن کے سمجھنے کے لئے ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کا ہونا ناگزیر ہے یا تو آدمی کے سینہ کے دروازے کھلے ہوئے ہوں اور فہم وادراک کی روشنی اس کے اندر زندہ ہو، یا یہ کہ اپنے کانوں کو وہ اس کے لئے کھول دے اور طبیعت کی آمادگی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرے۔

جو لوگ ان دونوں باتوں سے محروم ہیں وہ قرآن مجید کے فیض سے محروم ہیں۔ ان لوگوں کی تصویر سورہ محمد میں ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔

| | |
|---|---|
| اَفَلَا یَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوبٍ اَقْفَالُهَا. (۱) | کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں! |

یہ منافقین کا حال بیان ہوا ہے، منافقین قرآن مجید پڑھتے تھے، لیکن دلجمعی اور حضور قلب کے ساتھ نہیں بلکہ بے دلی اور نفرت کے ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ قرآن مجید کی آیتوں پر سے سرسری گزر جاتے تھے، حالانکہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اس پر تدبر کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کی تلاوت کے باوجود وہ عقیدہ اور عمل کی تمام خرابیوں میں مبتلا رہے۔

اصل یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے قرآن مجید کی اصلی نوعیت آئی ہی نہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہی ہے کہ فکر وتدبر کی چیز ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو آدمی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس پر تدبر کرے۔ اس کا انداز بحث واستدلال ہمارے منطقیوں کے ڈل کر دینے والے انداز بحث واستدلال سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ صغریٰ وکبریٰ بنائے اور پھر نتیجہ نکال کر مخاطب کو چپ کر دے۔ قرآن مجید دنیا کو چپ کرنے کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ عقل انسانی کی تربیت کے لئے آیا ہے وہ یہ کرتا ہے کہ آدمی کے فکر واستدلال کی قوتوں کو شہ دے کر ابھارتا ہے اور پھر ان کو اس راہ پر لگا دیتا ہے جو فطرت کی راہ ہے اور جس میں کوئی کج پیچ نہیں ہے۔ اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ دلائل اور آیات کی طرف انگلی اٹھا دیتا ہے۔ ا

(۱) محمد : ۲۴

استدلال کے بعض پہلوؤں کو کسی قدر بے نقاب کر دیتا ہے۔ نتیجہ کے بعض گوشوں کی طرف بھی کبھی اشارہ کر دیتا ہے، باقی رہا صغریٰ و کبریٰ کی تمام کڑیوں کو ملانا اور نتیجہ تک پہنچنا تو یہ کام وہ خود نہیں انجام دیتا بلکہ اس کو وہ مخاطب پر چھوڑ دیتا ہے تا کہ وہ تدبر کرے اور خود اپنی رہنمائی میں ان نتائج تک پہنچ جائے جن تک پہنچنا چاہیے، وہ چند چیزوں کا نام لے دینے کے بعد یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَآیَاتٍ (۱) اس میں دلیلیں ہیں، کیا دلیلیں ہیں؟ عموماً وہ اس کی تفصیل نہیں کیا کرتا بلکہ اس کام کو وہ مخاطب پر چھوڑ دیتا ہے۔ یہ مخاطب کا فرض ہے کہ وہ تدبر کرے اور موقع کلام کے حدود کے اندر رہ کر ان دلیلوں کا سراغ لگائے۔

سورہ نحل کے ایک مقام پر غور کیجئے قرآن مجید کے طریق استدلال کی پوری حقیقت آپ پر بے نقاب ہو جائے گی۔

هُوَ الَّذِی اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَکُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَ مِنْهُ شَجَرٌ فِیهِ تُسِیمُونَ. یُنْبِتُ لَکُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّیْتُونَ وَ النَّخِیلَ وَ الاَعْنَابَ وَ مِنْ کُلِّ الثَّمَرَاتِ. اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَآیَةً لِقَوْمٍ یَتَفَکَّرُونَ. وَ سَخَّرَ لَکُمُ اللَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِاَمْرِهِ. اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَآیَاتٍ لِقَوْمٍ یَعْقِلُونَ.. وَمَا ذَرَأَ لَکُمْ فِی الاَرْضِ مُخْتَلِفاً اَلْوَانُهُ. اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَآیَةً لِقَوْمٍ یَذَّکَّرُونَ. (۲)

وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا جس میں سے تم پیتے بھی ہو اور اس سے وہ نباتات بھی اگتی ہیں جن میں تم مویشیوں کو چراتے ہو۔ وہ اس سے تمہارے لئے کھیتی زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے، بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سوچیں۔ اور اس نے رات اور دن، سورج اور چاند کو تمہاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے اور ستارے بھی اسی کے حکم سے نفع رسانی

(۱) یونس: ۶۷، الرعد: ۳-۴، ابراهیم: ۵

(۲) النحل: ۱۰-۱۳

میں لگے ہوئے ہیں، بے شک اس میں
نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھیں
اور زمین میں جو چیزیں تمہارے لئے
گوناگوں قسموں کی پھیلائیں، بیشک اس
میں بھی بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے
جو یاددہانی حاصل کریں۔

یہاں علی الترتیب تین لفظ آئے ہیں لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ' (غور کرنے والوں کے لئے) لِقَوْمٍ یَعْقِلُوْنَ (سمجھنے والوں کے لئے) لِقَوْمٍ یَذَّکَّرُوْنَ یاددہانی کرنے والوں کے لئے) پھر ایک جگہ فرمایا'' اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً'' اس میں ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ کیا دلیل ہے؟ کچھ نہیں بتایا۔ تفکر سے معلوم ہوگی۔ دوسری جگہ فرمایا'' اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ'' اس میں دلیلیں ہیں۔ کیا دلیلیں ہیں اور کس چیز پر ہیں؟ ان سوالوں کا بھی جواب نہیں دیا بلکہ فرمایا جو عقل سے کام لیں گے وہ خود پا جائیں گے۔ پھر بعض چیزوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا ان فی ذلک لآیۃ اس میں ایک دلیل ہے۔ کیا دلیل ہے؟ کس بات پر دلیل ہے؟ اس کا بھی جواب نہیں دیا تا کہ مخاطب کی قوت فکر وتدبر خود اپنا کام کرے اور ان دلیلوں کو معلوم کرے۔

دلائل اور حکمت کی باتیں بیان کرنے کے لئے قرآن مجید کا عام ڈھنگ یہی ہے جو اوپر بیان ہوا۔ وہ حکمت کا ایک وافر ذخیرہ اور ایک بے پایاں خزانہ آیت کے پردوں میں چھپا دیتا ہے تا کہ انسان خود ان پردوں کو ہٹائے اور جس قدر اس میں سے لے سکتا ہے لے لے۔ اصلی چیز حکمت کو دریافت کرنے کا سلیقہ ہے۔ اگر یہ سلیقہ کسی شخص کے اندر پیدا ہو جائے تو قرآن مجید میں حکمت کا ایسا خزانہ مدفون ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ خود قرآن کا اپنا بیان یہ ہے:

قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ     کہہ دو: میرے رب کی نشانیوں

لَنَفِدَ البَحْرُ قَبلَ اَن تَنفَدَ کَلِمَاتُ رَبّی وَ لَو جِئنَا بِمِثْلِهٖ مَدَداً.(۱)

کو قلم بند کرنے کے لئے سمندر روشنائی بن جائے تو میرے رب کی نشانیوں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اگر اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملا دیں۔

ترمذی کی ایک حدیث میں بھی یہی حقیقت نہایت خوبی کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ حارث اعور راوی ہیں:

مررت فی المسجد فاذا الناس یخوضون فی الاحادیث فدخلت علیٰ علی فقلت : یا امیر المومنین الا ترن ان الناس قد خاضو فی الاحادیث ؟ قال او قد فعلوها قلت نعم قال اما انی قدسمعت رسول الله ﷺ یقول الا انها ستکون فتنة فقلت فماالمخرج منها یا رسول الله ؟ قال کتاب الله فیه نبأ ما قبلکم و خبر مابعدکم وحکم ما بینکم وهو الفصل لیس بالهزل. من ترکه من جبار قصمه الله ومن ابتغیٰ الهدیٰ فی غیره اضله الله و هو حبل الله

میں مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کہ کچھ لوگ بعض مسائل میں کر بزی کر رہے ہیں۔ میں نے حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا یا امیر المومنین آپ کے علم میں ہے کہ کچھ لوگ بعض مسائل میں کر بزی کر رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا اچھا یہ باتیں ہونے لگیں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں ! فرمایا یاد رکھو میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات سنی ہے آپ نے فرمایا کہ عنقریب ایک بڑا فتنہ سر اٹھائے گا۔ میں نے عرض کیا اس سے نجات کیا چیز دلائے گی یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا اللہ کی کتاب۔ اس میں تمہارے لئے پہلوں کی سرگزشت ہے، جو کچھ بعد میں

(۱) الکھف : ۱۰۹

المتين و هو الذكر الحكيم وهو
الصراط المستقيم هو الذى لا تزيغ
به الاهواء ولا تلتبس به الالسنة و لا
تشبع منه العلماء ولا يخلق على
كثرة الرد ولا تنقضى عجائبه وهو الذى
لم تنته الجن اذا سمعته حتىٰ
قالوا انا سمعنا قرآنا عجبا يهدى الىٰ
الرشد فامنا به من قال به صدق و
عمل به اجر ومن حكم به عدل و
من دعا اليه هدىٰ الىٰ صراط مستقيم
خذها اليک يا اعور.(۱)

آنے والا ہے اس کی خبر ہے۔اور جو کچھ تمہارے درمیان پیدا ہوگا اس کا فیصلہ ہے اور یہ ایک دوٹوک بات ہے۔کوئی ہنسی دل لگی نہیں ہے۔جو سرکش اس کو چھوڑے گا اللہ اس کی پشت کی ہڈی توڑ دے گا جو اس کے سوا کوئی اور مرجع ہدایت بنائے گا خدا اس کو گمراہ کردے گا۔خدا کی مضبوط رسی یہی ہے حکمت سے بھری ہوئی کتاب یہی ہے خدا کی کھولی ہوئی سیدھی راہ یہی ہے۔اس کے ہوتے خواہشیں نہیں گمراہ کرتیں اور زبانیں نہیں لڑکھڑاتیں۔علماء اس سے کبھی آسودہ نہیں ہوتے۔کتنی ہی پڑھو اس سے سیری نہ ہوگی۔اس کے عجائب حکمت کبھی ختم نہ ہوں گے۔اس کو سنتے ہی جن پکار اٹھے انا سمعنا قرآنا عجبا الآیہ جس نے اس کی سند پر کہا، سچ کہا، جس نے اس پر عمل کیا اجر پائے گا جس نے اس کی مدد سے فیصلہ کیا اس نے عدل کیا، جس نے اس کی دعوت دی اس صراط مستقیم کی دعوت دی اعور! ان باتوں کو گرہ کرلو۔

(۱) الدارمی: فضائل القرآن: ۱، صحیح الترمذی: ثواب القرآن: ۱۴

## ولقد یسرنا القرآن کی صحیح تاویل:

اس سلسلہ میں ایک اور بات رہ گئی ہے تھوڑی دیر توقف کرکے اس پر بھی غور کرلینا چاہیے جو لوگ قرآن مجید کو غور وفکر کی چیز نہیں سمجھتے وہ عموماً آیت وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۱) (ہم نے قرآن کو یاددہانی کے لئے آسان بنایا تو ہے کوئی جو اس سے یاددہانی حاصل کرے) حجت پکڑتے ہیں اس آیت کو دلیل ٹھہرا کر وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید ایک سیدھی سادھی کتاب ہے پند وموعظت کی ضروری باتیں اس میں نہایت آسان لفظوں میں بیان کردی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی تعریف میں فرمایا ہے کہ ہم نے اس کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے نہایت آسان بنایا ہے پھر اس کی ایک ایک سورہ پر آٹھ آٹھ برس تک سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہر شخص جو عربی جملوں کا مطلب سمجھ سکتا ہے وہ بے تکلف قرآن مجید کی آیتوں کے معانی ومطالب بھی سمجھ سکتا ہے وہ خواہ مخواہ کے لئے روایات، تفاسیر اور شان نزول وغیرہ کا ممنون احسان کیوں ہو؟ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہاں مختصراً آیت وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ کا صحیح مفہوم بیان کردیں۔

قرآن مجید کے ایک سپاٹ کتاب ہونے کے ثبوت میں عموماً لوگ اس آیت کو پیش کرتے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں نے خود اس آیت کے اصل مفہوم پر غور نہیں کیا۔ اس آیت کا عام طور پر جو مطلب مشہور ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید نصیحت حاصل کرنے کے لئے نہایت آسان کتاب ہے، یہ بات بجائے خود نہایت صحیح ہے لیکن اس آیت کا یہ مطلب صحیح نہیں ہے ۔ بلاشبہ تفسیر کی کتابوں میں اس آیت کی تاویل میں بعض ایسے اقوال بھی نقل ہوگئے ہیں جو غلط فہمی پیدا کرنے والے ہیں مثلاً بعضوں نے کہا ہے کہ قرآن مجید حفظ کرنے کے لئے نہایت آسان کتاب ہے لیکن ساتھ ہی اس کی تاویل میں سلف سے ایسے اقوال بھی نقل ہیں جو اصل حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن اردو مترجمین کو اس کے صحیح مفہوم

(۱) القمر : ۲۲

کے ادا کرنے میں دقتیں پیش آئی ہیں جس کا سبب زیادہ تر اردو زبان کی بے مائگی اور نارسائی ہے۔ بسا اوقات عربی زبان کا ایک چھوٹا سا لفظ جن وسیع معانی پر مشتمل ہوتا ہے اردو زبان کا ایک پورا فقرہ بھی ان کو نہیں سمیٹ سکتا ایسے مواقع پر مترجمین مجبوراً ادائے مطلب کے لئے کوئی ایسا لفظ اختیار کرلیتے ہیں جو مفہوم کا بس ایک حد تک تعبیر کردیتا ہے۔ یہ ترجمہ اور تعبیر کی عالمگیر مشکل ہے جو ہر زبان کے مترجم کو پیش آتی ہے لیکن جو شخص قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کرنا چاہے اس کے سامنے تو بسا اوقات ایسی مشکلیں آجاتی ہیں کہ بالکل ہی عاجز کردینے والی ہوتی ہیں۔

اسی قسم کی مشکل اس آیت میں بھی موجود ہے اس وجہ سے اس کے دولفظوں یسرنا اور للذکر پر ہم لغت، کلام عرب اور قرآن مجید کی روشنی میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

ارباب تاویل نے یسرنا کا مفہوم مختلف لفظوں سے ادا کیا ہے مجاہد فرماتے ہیں ھوناہ (۱) ہم نے اس کو آسان کردیا، ابن زید فرماتے ہیں بیناہ (۲) ہم نے اس کو کھول دیا ہے، ہمارے اردو مترجمین اس کا ترجمہ کرتے ہیں ہم نے اس کو آسان بنادیا لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ ان تمام تعبیروں میں سے کوئی بھی ایسی تعبیر نہیں ہے جو اس لفظ کی صحیح روح کو پیش کرتی ہو اور جس سے اس لفظ کے تمام اطراف و جوانب روشنی میں آجاتے ہوں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان سے لفظ کا مفہوم ایک حد تک ادا کردیا گیا ہے۔

یسر کے معنی اصل لغت میں نرمی اور فرمانبرداری کے ہیں۔ اسی سے تیسیر ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی شے کو کسی مقصد کے لئے بالکل موزوں، صالح موافق اور سازگار بنالینا مثلاً کہیں گے یسر الفرس اس کے معنی ہوں گے گھوڑے کو زین، رکاب اور لگام سے آراستہ

(۱) تفسیر ابن کثیر ۴۷۴/۶، فی ظلال القرآن ۳۴۴۱/۶، صفوۃ التفاسیر ۲۴۶/۳، تفسیر ابن جریر ۷/۴۷ (۲) تفسیر ابن جریر ۲۷: ۴۶

کر کے سواری کے لئے بالکل تیار کرلیا۔ یسر ناقته للسفر إذا رحلها و یسر الفرس للغزو إذا أسرجه والجمه۔ اعرج معنی کا شعر ہے:

قمت اليه باللجام ميسرا

هنالك يجزيني الذی كنت اصنع (۱)

میں اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا اور حال یہ تھا کہ وہ لگام کے ساتھ بالکل تیار کھڑا تھا ایسے ہی وقتوں میں وہ میرے احسانات کا حق ادا کرتا ہے۔

یعنی جس چیز سے جو کام لینا ہے یا جو مقصد حاصل کرنا ہے اس مقصد کے لئے اس کو اس قدر ساز گار اور مناسب بنا لیا جائے کہ اگر کوئی شخص اس سے وہ مقصد حاصل کرنا چاہے تو بہتر سے بہتر طریقہ پر حاصل کر سکے۔ یہاں تک کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اس سے زیادہ قریبی اور آسان راہ کوئی دوسری باقی نہ رہ جائے۔ یہیں سے اہل اور لائق بنانے کا مفہوم بھی اس لفظ میں پیدا ہو گیا ہے، مضرس بن ربعی کا شعر ہے۔

ونعين فاعلنا علىٰ مانابه

حتى نيسره لفعل السيد (۲)

(ہمارے سردار کو جو مشکلیں پیش آتی ہیں ہم اس میں اس کی مدد کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کو سرداری کے کام کا اہل بنا دیتے ہیں۔)

للذکر کا ترجمہ بعض مترجمین نے نصیحت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے اور بعض اکابر نے سمجھنے کے لئے ہمارے نزدیک یہ دوسرا ترجمہ لفظ کی روح سے زیادہ قریب ہے، گو اصل لفظ کا پورا قائم مقام یہ بھی نہیں ہے۔ 'ذکر' کے اصل معنی یاد کرنے اور بیان کرنے کے ہیں یہ لفظ قرآن مجید میں کتاب آسمانی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے

(۱) شرح ديوان الحماسة ۲/ ۴۹۳

(۲) أيضاً ۲: ۴۱

مثلاًفَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ (۱) (اہل کتاب سے پوچھو) قرآن مجید کیلئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ اَنْزَلْنٰهُ (۲) (اور یہ مبارک ذکر ہے، جس کو ہم نے اتارا ہے) قرآن مجید کیلئے بطریق صفت بھی استعمال ہوا ہے مثلاً وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ (۳) (ذکر والے قرآن کی قسم)

قرآن مجید کو ''ذکر'' کے لفظ سے تعبیر کرنے سے ایک خاص حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ تعلیم الٰہی سرتاپا فطرت انسانی کا بیان و اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام اور آسمانی صحیفوں کے ذریعہ سے جو تعلیم دی ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسان پر اس کے اوپر سے چپکا دی گئی ہو بلکہ یہ خود انسان کے باطن کی صدا اس کی روح کا نغمہ اور اس کی فطرت کا اقرار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تعلیم کے مبادی انسان کے اندر ودیعت کر دئے تھے اور پھر انہی مبادی کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے آشکارا کیا اسی وجہ سے اسلام کو دین فطرت کہا گیا ہے۔ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۴) (اس دین فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا) اور حضرات انبیاء کرام کو مذکر (۵) (یاد دہانی کرنے والے) اور ان کی تعلیم و دعوت کو تذکیر و ذکریٰ (یعنی یاد دہانی) کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے، فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (۶) (پس یاد دہانی کرو اگر یہ یاد دہانی کچھ نفع پہنچائے) کیونکہ حقیقت میں تعلیم الٰہی یاد دہانی کے سوا کچھ ہے ہی نہیں، دین و مذہب کا یہ پورا نظام انسان کے خارج سے نہیں اگا ہے بلکہ اس کا تخم اس کی فطرت کے اندر پوشیدہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص بندوں کے ذریعہ سے اس کی آبیاری کا سامان فرمایا اور وہ ایک تناور درخت بن گیا۔ جس طرح زمین نمو اور روئیدگی کے تمام خزانوں سے معمور ہے لیکن بارش کی محتاج ہے کہ وہ نازل ہو کر اس کے تمام خزانوں کو ابھار کر سطح پر پھیلا دے، اسی طرح فطرت انسانی بھی علم و حکمت کے تمام خزانوں سے معمور ہے لیکن اس کی شادابی و

(۱) الأنبياء : ۷ — (۲) أيضاً : ۵۰
(۳) ص : ۱ — (۴) الروم : ۳
(۵) الغاشية : ۲۱ — (۶) الأعلى : ۹

زرخیزی ایک آسمانی بارش کی محتاج ہوتی ہے۔جب وہ بارش ہو جاتی ہے تو اس کا چپہ چپہ رشک جنت بن جاتا ہے اور اگر یہ بارش نہ ہوتی تو انسانی فطرت ایک مردہ زمین کی مانند بن جاتی جو اخلاقی و روحانی زندگی کے آثار سے یک قلم محروم ہوتی ۔یہ آسمانی بارش اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب قرآن حکیم ہے۔

قرآن مجید کے مختلف ناموں میں سے تذکرہ (۱) اور نور (۲) دو نام ایسے ہیں جو نہایت واضح طور پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو اوپر بیان ہوئی ہے۔تذکرہ کے معنی یاددہانی کے ہیں جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ قرآن مجید ہم کو جو کچھ تعلیم دیتا ہے وہ بالکل فطرت ہونے کی وجہ سے ایسی دلنشین ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہم کو ہمارا ہی بھولا بسرا ہوا سبق یاد دلا رہا ہے۔کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہا ہے جو ہمارے لئے انوکھی اور اوپری ہو۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نور کے معنی روشنی کے ہیں روشنی اشیاء کو نمایاں کر دیتی ہے۔جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ انسانی فطرت کے تہ بہ تہ پردوں کے اندر علم وحکمت کے جو لعل و گہر چھپے ہوتے ہیں۔کتاب الٰہی کی روشنی نمودار ہو کر ان کو آنکھوں کے سامنے کر دیتی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ذکر کا لفظ نہایت اہم ہے یہ تمام علم وحکمت کا سرچشمہ ہے یہ لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اصلی علم کے حاصل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ انسان ان اسباق کو یاد کرے جو اس کی فطرت کو روز ازل میں پڑھائے گئے ہیں لیکن وہ ان کو بھولا ہوا ہے۔معرفت وحکمت کے تمام اسرار اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت کے اندر ودیعت فرمادئے ہیں لیکن ہم یا تو ان کو بھولے ہوئے ہیں یا وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ان کو حاصل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ ہم ان کو یاد کرنے اور حافظہ کے سامنے لانے کی کوشش

(۱) طٰہٰ: ۳، الحاقۃ: ۴۸، المزمل: ۱۹، المدثر: ۴۹

(۲) النساء: ۱۷۴، الشوریٰ: ۵۲

کریں۔اس کام میں ہماری مدد اور رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء مبعوث فرمائے اور کتابیں نازل فرمائیں اور پھر سب سے آخر میں قرآن مجید کو اتارا جو اس مقصد یاددہانی کیلئے سب سے زیادہ موزوں ،سب سے زیادہ کارآمد ،اور تمام کتابوں میں آخری کتاب ہے۔اس اعتبار سے قرآن مجید بلاشبہ نہایت آسان کتاب ہے۔علم وحکمت کی بلندیوں تک پہنچنے کا اس سے زیادہ سہل اور آسان راستہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔سب سے زیادہ مامون راہ یہی ہے۔دوسری راہوں میں گمراہیاں ہیں، فتنے ہیں، دشوارگزار گھاٹیاں ہیں، ناقابل عبور سمندر ہیں، ہولناک بیابان اور صحرا ہیں۔مگر قرآن مجید کی راہ بالکل بے خطر ہے۔اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی کھولی ہوئی راہ یہی ہے۔اس وجہ سے اس میں کوئی کجی نہیں ہے۔یہ صراط مستقیم ہے۔یہ دین قیم ہے اور انسانی اور شیطانی تصرفات اس کی سدھائی کو کج نہیں کرسکتے ہیں جو اس راہ کو اختیار کرے گا وہ خدا تک پہنچے گا مگر اسکے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اس راہ کے رہرو کو قطع مسافت اور زاد و راحلہ کی تمام زحمتوں سے بھی سبکدوشی حاصل ہوجاتی ہو اور وہ بغیر ایک قدم چلے اور بغیر کوئی تکلیف اٹھائے آپ سے آپ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہو۔کل تک سمندروں میں بادبانی کشتیاں چلتی تھیں اور سمندر کا سفر کرنے والے جان کی بازی کھیل کر یہ سفر اختیار کرتے تھے اب ان کی جگہ دخانی جہازات نے لے لی ہے جن کی وجہ سے بحری سفر کی بے پایاں مشکلات ایک بڑی حد تک قابو میں آگئی ہیں۔لیکن سمندر پھر بھی سمندر ہی رہا، خشکی نہیں بن گیا ہے یہی حال ہماری روحانی اور اخلاقی دنیا کا بھی ہے۔قرآن مجید کے نازل ہونے سے پہلے ہم خدا کی معرفت کے سمندر کو گویا بادبانی کشتیوں کے ذریعہ طے کرتے تھے۔اور اس سفر میں بے شمار خطرات اور بے شمار آفتوں سے دوچار ہوتے تھے لیکن قرآن مجید کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اس سمندر کے لئے وہ سفینہ بھیج دیا جو تکمیل کار کا بالکل آخری نمونہ ہے۔اس نے تمام براعظموں کی سرحدیں ملادیں، سمندر کی تمام ہولناکیاں مسخر کرلیں، موجوں، طوفانوں اور برف کی چٹانوں کو زیر کرلیا۔یہ سب

کچھ ہوا لیکن سمندر پھر بھی سمندر ہی رہا اپنے مکان کا صحن نہیں بن گیا ہے۔

پس قرآن مجید کے سہل ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ اگر کوئی طالب علم اس کی رہنمائی میں حقیقت تک پہنچنا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد ہوگی کیونکہ اس نے وہ راہ اختیار کر لی ہے جو خود اللہ کی کھولی ہوئی راہ ہے اور جس سے زیادہ سیدھی اور ہموار راہ کوئی دوسری نہیں ہے۔ حضرت مطرؒ نے هل من مدكر کی تاویل فرماتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

هل من طالب علم فيعان عليه (۱) ہے کوئی طالب علم جس کی مدد کی جائے؟

اس حقیقت کی طرف صاحب کشاف ان الفاظ میں اشارہ فرماتے ہیں:

يجوز أن يكون المعنى ولقد هياناه للذكر من يسر ناقته للسفر إذا رحلها ويسر فرسه للغزو إذا اسرجه و الجمه. (۲)

یعنی اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے ذکر (یعنی حصول علم) کے لئے قرآن مجید کو تیار کر دیا ہے جیسا کہ محاورہ ہے یسر ناقته للسفر ویسر فرسه للغزو (اس نے اونٹنی کو سفر کے لئے اور گھوڑے کو میدان جنگ کے لئے تیار کیا)

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اس آیت کا عام طور پر جو مطلب لوگ لیتے ہیں اور پھر اس سے جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، جس سورہ میں یہ آیت وارد ہوئی ہے، اس پر غور کرنے سے بھی وہی حقیقت سامنے آتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ یہ آیت سورہ قمر میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ سورہ قمر میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ کفار وعدہ قیامت کی تکذیب کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر عذاب کو واقعی آنا ہے تو اس کی کوئی نشانی ہمارے پاس آجائے، ذرا ہم اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ لیں، اس کے بعد

(۱) تفسیر ابن جریر: ۲۷/۹۷

(۲) الکشاف : ۴/۳۸

ایمان لائیں گے (۱)۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس سے پہلے بہت سی قوموں نے اسی طرح عذاب کا مطالبہ کیا اور وہ ہلاک کردی گئیں، کیونکہ عذاب کی نشانی دیکھنے کے باوجود ان پر ایمان وہدایت کی راہ نہیں کھلی۔ ایمان وہدایت کی راہ یہ ہے کہ آدمی اپنی عقل سے کام لے، جب انہوں نے عقل اور سمجھ کی رہنمائی قبول کرنے سے انکار کردیا تو ایمان وتصدیق تک پہنچنے کا کوئی راستہ ہی باقی نہیں رہا۔ عقل کو معطل کردینے ہی کی وجہ سے انہوں نے آسمان وزمین کی بے شمار نشانیوں کی تکذیب کی ہے، بے شمار اچنبھوں کو جھٹلادیا ہے، لاتعداد معجزات سے آنکھیں بند کرلی ہیں، پھر کیسے ممکن ہے کہ جنہوں نے ہزاروں کا انکار کردیا ہو۔ وہ ایک کو مان لیں گے جس خیرگی کے سبب سے انہوں نے سب کا انکار کیا، اسی خیرگی کے سبب سے وہ اس ایک کا بھی انکار کردیں گے، اس وجہ سے آیات و معجزات کا مطالبہ بالکل فضول ہے۔ اگر وہ ایمان لانا چاہتے ہیں اور یہ وعدہ محض مذاق اور شرارت نہیں ہے بلکہ سچائی کے ساتھ ان کے دل کا اقرار ہے تو پھر علم اور عقل کی راہ اختیار کریں۔ علم کے حصول کے لئے ہم نے قرآن مجید کو نہایت مکمل اور موزوں بنادیا ہے، اس میں ہر سوال کا جواب ہے، ہر شبہ کا ازالہ ہے، ہر خلش کے لئے تشفی ہے۔ بس اس کو اختیار کرلیں وہ ہر منزل میں رہنمائی کرے گا اور ہر عقدہ کو حل کردے گا۔

## تیسیر کے بعض پہلو:

تیسیر قرآن کی اصل حقیقت سمجھ لینے کے بعد اب آئیے یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو علم اور معرفت حاصل کرنے کے لئے کتنے مختلف پہلوؤں سے موزوں بنایا ہے۔

(۱) اس سلسلہ میں سب سے پہلی قابل ذکر بات قرآن مجید کا عربی مبین میں نازل ہونا ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس خصوصیت کا ایک سے زیادہ مقامات پر تذکرہ فرمایا

(۱) دیکھیں آیات: ۱-۳ اور ۲۵

ہے انا انزلناہ قرآن عربیا (۱) ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا کتاب فصلت آیاتہ قرآنا عربیا (۲) (یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتوں کی تفصیل عربی قرآن کی صورت میں کی گئی)۔ وھذا لسان عربی مبین (۳) (یہ فصیح عربی زبان ہے)

قرآن مجید کے اولین مخاطب عرب تھے۔ ان کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ تھی کہ قرآن مجید عربی میں ہو۔ بغیر اس کے ان کے لئے قرآن مجید سے فائدہ اٹھانا نہایت مشکل ہوتا، یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ قرآن مجید ان کے لئے پوری طرح نہیں کھولا گیا کیونکہ اس کی زبان عجمی ہے اور وہ عرب ہیں۔ عربی اور عجمی کا کیا جوڑ؟ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّ عَرَبِيٌّ (۴) (اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی قرآن کی شکل میں اتارتے تو یہ لوگ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیات کی وضاحت کیوں نہیں کی گئی! کلام عجمی اور مخاطب عربی) اس لئے قرآن مجید عربی میں نازل ہوا پھر عربی بھی وہ عربی جو عربی مبین ہے، بالکل واضح اور صاف، مغلق اور پیچیدہ نہیں جس کو ہر طبقہ بآسانی سمجھ سکے، محدود اور تنگ نہیں جس کے اسالیب وقواعد اور الفاظ ومحاورات قبیلوں اور جماعتوں کے ساتھ مخصوص ہوں، بلکہ وہ عربی جو فصحائے عرب کی بولی تھی، جس کو سب سمجھتے تھے اور جس کی فصاحت پر سب کا اتفاق واجماع تھا۔ پس عربی زبان میں قرآن مجید کا اترنا عربوں کے لحاظ سے نہایت کھلی ہوئی تیسیر تھی۔ چنانچہ بعض آیات میں اس کی تصریح بھی ہے، فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا (۵) (ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں اس لئے سہل وسازگار بنایا کہ تم خداترسوں کو بشارت پہنچا دو اور جھگڑالو قوم کو آگاہی سنا دو) فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۶) (پس ہم نے قرآن کو تمہاری

(۱) یوسف : ۲ (۲) حم السجدة : ۳
(۳) النحل : ۱۰۹ (۴) حم السجدة : ۴۴
(۵) مریم : ۹۷ (۶) الدخان : ۵۸

زبان میں نہایت خوبی سے آراستہ کیا تا کہ وہ یاددہانی حاصل کریں)

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ تیسیر عربوں کے لئے ہوئی، عجمیوں کو قرآن کے عربی زبان میں اترنے سے کیا فائدہ ہوا؟ یہ اعتراض بجا ہے، تیسیر کا یہ پہلو عربوں کے لئے مخصوص ہے جو قرآن مجید کے اول مخاطب تھے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے دوسری قوموں کی ہدایت کے لئے واسطہ بنایا تھا لیکن اس مسئلہ پر ایک دوسرے پہلو سے نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے عربی زبان میں اترنے میں ایک پہلو عمومی تیسیر کا بھی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید کے لئے کسی خاص قوم پر اور کسی خاص زبان میں نازل ہونا ناگزیر تھا۔ اس کا براہ راست تمام قوموں پر تمام زبانوں میں اترنا نہ تو ممکن تھا نہ یہ بات مصلحت عالم کے مطابق ہی ہوتی۔ اسلام ایک عالمگیر وحدت کی دعوت ہے اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ دنیا کو جو آخری پیغام دیا جائے اس کا مرکز ایک قوم، ایک مقام، ایک وجود، اور ایک زبان (۱) ہو۔ حکمت الٰہی نے قوموں میں سے بنی اسماعیل کو مقامات میں سے مسکن ابراہیم کو، اشخاص میں سے محمد بن عبداللہ ﷺ کو، زبانوں میں سے عربی مبین کو منتخب فرمایا اور آج اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ انتخاب ایک بہترین انتخاب تھا! مذہب کے حقائق، حکمت کے نکات و رموز اور عالم غیب کے اسرار بیان کرنے کے لئے عربی زبان سے بڑھ کر اور کون زبان موزوں ہو سکتی تھی! اس وجہ سے قرآن کا عربی زبان میں اترنا جس طرح عربوں کے لئے رحمت تھا اسی طرح بعض پہلوؤں سے یہ تمام عالم کے لئے رحمت ہے۔

۲۔ تیسیر کا دوسرا پہلو قرآن کا تھوڑا تھوڑا نازل ہونا ہے۔ اگر پورا قرآن مجید بیک وقت نازل ہو جاتا تو اس کی تعلیمات دلوں میں راسخ نہ ہو پاتیں۔ گہری باتیں اسی وقت دلوں میں جڑ پکڑا کرتی ہیں جبکہ وہ آہستہ آہستہ، سبق سبق کر کے سیکھی جاتی ہیں۔ اس طرح وہ دل و دماغ

(۱) آخری دین کے لئے اسے ایک زبان میں ہونا ضروری تھا؟ اس سوال کا جواب ہم نے اپنی کتاب ''دعوت دین اور اس کا طریق کار'' میں دیا ہے۔

میں پوری طرح سرایت کرتی ہیں اور ایک ایک بات عمل میں آکر پختہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے معاملہ میں ایسا ہی کیا اس کو بیک دفعہ نہیں نازل فرمایا بلکہ آہستہ آہستہ، حالات کے تقاضے اور ضروریات کے مطالبہ پر نازل فرمایا اور جب کفار نے اعتراض کیا کہ قرآن مجید تورات کی طرح بیک دفعہ کیوں نہیں نازل ہو جاتا، جستہ جستہ کیوں اترتا ہے تو ان کے جواب میں فرمایا:

كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيلًا (۱)

ہم نے ایسا ہی کیا تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو تدریج و اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ. (۲)

تاکہ تم اس کو لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سناؤ۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حصول علم (ذکر) کا سب سے زیادہ صحیح اور آسان طریقہ یہی ہے اس لئے قرآن مجید نے اسی کو اختیار فرمایا۔

۳۔ سورہ ہود کے شروع میں قرآن مجید کی تیسیر کے ایک نہایت اہم پہلو کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

كِتَابٌ اُحْكِمَتْ آيَاتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ. (۳)

یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے ابتدا میں محکمات اور کلیات دین کی تعلیم

(۱) الفرقان : ۳۲

(۲) بنی اسرائیل : ۱۰۶

(۳) ہود : ۱

دی ،اس کے بعد جزئیات کی تفصیل فرمائی ، یہ طریقہ تعلیم فطرت انسانی کے بالکل مطابق ہے اس لئے قرآن نے بھی اس کو اختیار فرمایا۔ مکی سورتوں میں دین کی تمام اصولی تعلیمات ،توحید، رسالت ،معاد وغیرہ نہایت مختصر اور جامع لفظوں میں بیان ہوئی ہیں۔ان کی تفصیلات سے تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ان محکمات وکلیات کو ذہنوں میں اچھی طرح راسخ کر لینے کے بعد جزئیات کی تفصیل کی طرف توجہ فرمائی اور مدنی سورتوں میں تمام تفصیلات بیان ہوئیں۔قرآن مجید کا یہ طریقہ اجمال وتفصیل انسانی فطرت کے بالکل مطابق اوراحکام دین کی حکمت واضح کرنے کیلئے نہایت اعلیٰ ہے۔اس وجہ سے یہ چیز بھی تیسیر میں داخل ہے۔

۴۔تیسیر کا ایک نہایت اہم پہلو ایک ہی بات کو مختلف طریقوں اور پہلوؤں سے کہنا ہے تا کہ وہ بات اچھی طرح مخاطب کے ذہن نشین ہو جائے ۔قرآن مجید کی اصطلاح میں اس چیز کو تصریف آیات کہتے ہیں ۔قرآن مجید نے اس چیز کا ایک سے زیادہ مقامات میں ذکر فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| اُنظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ (۱) | دیکھو، کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں پھر بھی وہ اعراض کر رہے ہیں |
| اُنظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ (۲) | دیکھو، کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ سمجھیں۔ |

تصریف آیات کا مطلب قرآن کے تدبر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک ہی بات مختلف اسلوبوں اور مختلف دلیلوں سے بیان ہوتی ہے اور ایک ہی حقیقت کو اس کے مختلف پہلوؤں سے واضح کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ آیات قرآن کیلئے تصریف ریاح (۳) سے لیا گیا ہے۔تصریف ریاح کی حقیقت کیا ہے؟ ایک ہی ہوا ہے لیکن اس کے تصرفات کی

(۱) الانعام : ۴٦

(۲) أیضاً : ٦۵

(۳) البقرة : ۱٦۴ ، الجاثیة :۵

گونا گونی کی کوئی حد نہیں۔ وہ رحمت بھی ہے اور نقمت بھی، کبھی آہستہ آہستہ چلتی ہے اور چمن میں پھولوں کو کھلاتی اور کھیتوں میں فصلوں کو پکاتی ہے کبھی سموم بنکر نمودار ہوتی ہے اور چمنستانوں اور باغوں کو دشت وصحرا بنا کر چھوڑ دیتی ہے، کبھی بادلوں کو اپنے کندھے پر لاد کر لاتی ہے جو تمام زمین کو جل تھل کر دیتے ہیں کبھی ان کو ہنکا کر لے جاتی ہے اور ان کو ہنکا کر لے جانے ہی میں زمین والوں کے لئے خیر و برکت ہوتی ہے، صبح سے شام تک، شام سے صبح تک اور پھر سال کے مختلف مہینوں میں نہ جانے وہ کتنے بھیس بدلتی ہے اور اس کا ہر بھیس اس کائنات کی زندگی اور نشو نما کے لئے ضروری ہوتا ہے وہ کبھی گرم ہوتی ہے کبھی سرد، کبھی خشک ہوتی ہے کبھی تر، کبھی آندھی اور طوفان کی ہولنا کی بن کر نمودار ہوتی ہے، کبھی نسیم صبح کی جاں نوازی اور عطر بیزی بنکر، اللہ تعالیٰ نے اس تصریف ریاحُ کا مختلف مقامات میں ذکر فرمایا ہے۔ سورہ ذاریات (۱) اور مرسلات (۲) میں اسے عجائب تصرفات کی قسم بھی کھائی ہے۔

بعینہ یہی حال قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا ہے بعض اوقات ایک ہی آیت اتنے گونا گوں پہلو رکھتی ہے کہ ان سب کا احاطہ ناممکن ہوتا ہے اور ایک ہی مضمون اتنی مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہے کہ اس کا شمار کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس بات کو قرآن مجید تصریف آیت کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیے، سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ بارش کی مثال بیان فرمائی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَهُوَ الَّذِى يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْراً بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهِ . (۳) | اور وہی ہے جو اپنی باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے، |

(۱) دیکھیں: آیات: ۱-۴

(۲) دیکھیں: آیات: ۱-۵

(۳) الاعراف : ۵۷

اور بارش کی اس ایک ہی مثال سے تین مندرجہ ذیل حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔

۱۔خوف اور طمع ہر حال میں اللہ ہی کو پکارنا چاہیے۔اس سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے اس کی رحمت ہمیشہ اس کے بندوں سے قریب ہے۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عرصہ تک بارش نہیں ہوتی ہے۔تمام زمین جل بھن جاتی ہے۔آسمان کی طرف نگاہ اٹھائیے تو بارش کا کوئی نشان نہیں ملتا۔لیکن دفعۃً کسی کونے سے ابر کا کوئی ٹکڑا نمودار ہوتا ہے اور آناً فاناً ہر طرف جل تھل ہو جاتا ہے اور مایوسیاں امید سے بدل جاتی ہیں۔

اُدْعُوْهُ خَوْفاً وَّ طَمَعاً اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱)

اور اسی کو پکارو بیم ورجا دونوں حالتوں میں بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے۔

۲۔منکرین قیامت کو تعجب ہے کہ یہ کیسے ہوگا کہ جب لوگ سڑگل جائیں گے تو قبروں سے جی اٹھیں گے، حالانکہ اس پر ذرا بھی تعجب نہ ہونا چاہیے۔اس کا مشاہدہ ہم برابر کرتے رہتے ہیں۔تمام زمین جل گئی ہے۔گھاس کا ایک تنکا بھی کسی گوشہ میں نظر نہیں آرہا ہے دفعۃً بارش ہوتی ہے اور چند دنوں کے اندر دیکھتے ہیں کہ تمام سطح زمین پر سبزہ کی بانات بچھ گئی ہے۔

سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى (۲)

ہم اس کو ہانکتے ہیں کسی بے آب وگیاہ زمین کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں اور پھر ہم اسے پیدا کرتے ہیں ہر قسم کے پھل۔اسی طرح ہم مردوں کو اٹھا کھڑا کریں گے۔

۳۔بارش زمین کے ہر حصہ میں ہوتی ہے لیکن اس کے نتائج واثرات ہر جگہ یکساں نہیں ہوتے۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو زمینیں زرخیز تھیں۔پانی برستے ہی انہوں نے تمام مدفون خزانے اگل دئے۔باقی جو زمینیں شور تھیں ان میں یا تو کوئی چیز اگی ہی نہیں اور اگر اگی بھی

(۱) الأعراف : ۵۶

(۲) أيضاً : ۵۷

تو وہ چیز نہیں جس کا انسان پھل کھائے بلکہ وہ چیز جس سے آزار اٹھائے ۔ یہی حال آسمان کی روحانی بارش کا ہے ۔ زمین کے موسموں کی طرح اس کا بھی ایک موسم آتا ہے اور اس موسم میں خدا آسمان سے ہدایت نازل فرماتا ہے جس کا پیام یوں تو تمام انسانوں کے لئے عام ہوتا ہے لیکن فیض بقدر استعداد پہنچتا ہے، جو فطرت صالح ہوتی ہے وہ تو اس بارش سے نمو اور برکت حاصل کرتی ہے لیکن جو فاسد ہوتی ہے، اس بارش سے اس کا فساد ہیجان میں آجاتا ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا (۱)

اور زرخیز زمین کی پیداوار تو خوب اُگتی ہے اس کے رب کے حکم سے پر جو زمین ناقص ہوتی ہے اس کی پیداوار کم ہی ہوتی ہے ۔

دیکھئے بارش کی ایک ہی مثال سے کیا کیا حقیقتیں روشنی میں آئی ہیں، ان سب نتائج کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ (۲)

اسی طرح ہم اپنی آیات مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان لوگوں کیلئے جو شکر گزار بننا چاہیں

اس تصریف کو تعلیم یا تیسیر قرآن میں جس قدر دخل ہو سکتا ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے اس تصریف کا مقصد خود قرآن مجید کی تصریحات کے مطابق یہ ہے کہ لوگ یاد دہانی کریں اور سمجھیں۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا (۳)

اور ہم نے اس قرآن میں گوناگوں اسلوبوں سے بات واضح کردی کہ وہ یاد دہانی حاصل کریں لیکن یہ چیز ان کی بیزاری میں اضافہ کیے جا رہی ہے

انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ

دیکھو کس کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف

(۱) الأعراف : ۵۸

(۲) أيضاً : ۵۸

(۳) بنی اسرائیل : ۴۱

يَفْقَهُونَ (۱)        پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ سمجھیں۔

تیسیر قرآن کے یہ چند نمایاں پہلو بیان ہوئے ہیں ان کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو قرآن سے استنباط کر کے اس ذیل میں بیان کی جاسکتی ہیں لیکن اس سے زیادہ تفصیل کے لئے یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ آیت تیسیر کا جو مطلب عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اقلیدس اور ریاضی کی کسی کتاب کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ یہ کتاب اقلیدس اور ریاضی سیکھنے کے لئے نہایت آسان ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ فن اقلیدس اور ریاضی میں اب سرے سے کوئی مشکل ہی باقی نہیں رہ گئی ہے، بلکہ یہ مطلب ہوگا کہ ان فنون کی تعلیم کے لئے جو بہتر سے بہتر اسلوب اور طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں، یہ کتاب ان تمام اسلوبوں اور ان تمام طریقوں سے مزین ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کے متعلق جو یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ ذکر یعنی حصول علم اور یاد دہانی کے لئے نہایت آسان ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ علم دین فکر و تدبر کی تمام کاوشوں سے مستغنی ہوگیا بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس عظیم الشان علم کے حصول کے لئے ایک ایسی کتاب نازل ہوگئی ہے جو بہتر سے بہتر طریقہ پر خدا کے بندوں کو خدا کے دین کے حقائق سکھاتی ہے۔

قرآن مجید کے متعلق پچھلے صفحات میں ہم نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ درحقیقت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے چند اجمالی اشارات کی تفصیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب ہم ذیل میں مولانا کے خیالات خود ان کے الفاظ میں پیش کئے دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''(۱) قرآن پاک ایک ایسا کلام ہے کہ اسے نہایت کھلا اور آسان بھی کہہ سکتے ہیں اور نہایت چھپا اور مشکل بھی ۔۔۔۔ خدائے پاک کو دیکھو کہ ہم سب اسے جانتے ہیں اور پھر کوئی بھی نہیں جانتا، خود اپنے آپ کو سوچو کہ اور کسی چیز میں شک ہو تو ہو مگر اپنی ہستی میں بھی شک نہیں مگر پھر دیکھو تو بقول غالب:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی        کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

(۱) الأنعام :۶۵

قرآن خود بھی اپنے تئیں کھلا اور آسان بتاتا ہے مگر دوسرے لحاظ سے مستور و عمیق اسی طرح خدائے پاک کی نسبت کہتا ہے کہ وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔

(۲) ظاہر ہے کہ دو متناقض باتیں اگر ایک ہی جگہ پائی جاتی ہیں تو ضرور یہ اجتماع النقیضین دو مختلف پہلوؤں سے ہوگا پس قرآن پاک کا آسان اور مشکل ہونا دونوں ضرور دو حیثیت سے ہوگا۔ چنانچہ ضروری اور عام تعلیم کے لحاظ سے وہ نہایت آسان ہے مگر اعلیٰ تعلیم اور دقیق مضامین کے لحاظ سے نہایت مشکل ہے اور یہی مناسب ہے کیونکہ جو لوگ اعلی ترقی کی لیاقت تک نہیں پہنچے ان کے لئے وہ مضامین اگر ظاہر بھی کر دئے جائیں تو بھی نہ تو وہ اسے سمجھیں گے اور نہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے بلکہ ان کے فائدہ اٹھانے کی قابلیت کو بھی نقصان پہنچے گا، یہ اس لئے کہ دین کا راستہ سیر باطن ہے، سیر باطن تفکر اور تدبر سے ہوتی ہے اگر کسی شخص کو وہ باتیں جو وہ غور و فکر سے حاصل کر سکتا ہے پہلے ہی بتا دی جائیں تو اس کی قوت فکر ضائع ہو جائے گی اور اس بتائی ہوئی بات کو بھی اس تیقن کے ساتھ نہ سمجھے گا جیسا کہ چاہیے اور آئندہ کی ترقی سے محروم رہے گا، اسی لئے خدائے تعالیٰ نے نظام عالم میں کوشش کو ضروری قرار دیا تا کہ انسان اپنی علیٰ ترقی تک پہنچ سکے۔ تعلیم میں اس پہلو کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ تعلیم ایک لفظ بے معنی ہوگا۔ کیونکہ قوائے عقلیہ کے بیکار ہونے سے وہ علم بے ثمر ہوگا یہ بات تو علم ظاہری کی ہے علم باطنی کو اس سے کچھ زیادہ خیال کر لو کیونکہ اس میں جاننا اسی کا نام ہے جس کو ہونا کہتے ہیں۔ اچھی اور بری کو جاننا اور پھر رغبت اور نفرت کا نہ پیدا ہونا یہ جاننا دین میں معتبر نہیں۔ حکیم بھی اگر محض نام کا حکیم نہیں ہے تو ایسا ہی سمجھتا ہے۔ سقراط سرآمد حکمائے یونان کا یہی مذہب تھا وہ گناہ اور جہل کو ہم معنی کہتا ہے۔

(۳) پس عام حکمت الٰہی کے موافق جس پر مدار ترقی انسانی ہے۔ قرآن کو محل تدبر اور تفکر بتایا گیا ہے اور ظاہر کو باطن کی طرف متوجہ کیا گیا۔ خداوند تعالیٰ ہم کو ابتدائی نعمتیں عطا کر کے انتہائی نعمتوں کیطرف رہبری کرتا ہے اور جوں جوں ہم کوشش

کرتے جاتے ہیں، انعام کے مستحق ہوتے جاتے ہیں اور یہی عدل ہے ورنہ کیوں فرق مراتب ہے؟ پس اسی طرح فہم قرآن میں جوں جوں انسان ترقی کرتا جائے گا، اس پر اسرار کھلتے جائیں گے اور ایسے نمایاں طور پر کہ وہ ان کے سمجھنے اور ماننے پر مجبور ہوگا۔ پس درحقیقت یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ قرآن اپنے دقیق مضامین کے لحاظ سے بھی صاف اور آسان ہے اور اس کا چھپا ہونا محض اس بات کی خبر دیتا ہے کہ ابھی ہم پیچھے ہیں۔ چنانچہ خود قرآن ہم کو بتاتا ہے " جولوگ روشنی قبول کرتے ہیں خدا ان کی روشنی زیادہ کرتا ہے۔" عام تعلیم میں بھی یہ بات نظر آتی ہے کیسی ہی صاف تحریر ہو ابجد خواں کے لئے وہ پیچیدہ ہے مگر ایک ماہر کے نزدیک اس کو پیچیدہ کہنا صریحی ظلم ہوگا۔ قرآن نے اپنی اس صفت کو کہ وہ ایک عمیق اور مکنون کلام ہے خود بتادیا ہے، پیشانی کتاب پر تین حرف ایسے لکھ دیئے ہیں جن کے معنی باوجود اسقدر کوشش کے اب تک ظاہر نہ ہوئے گویا اس کے معنوی راہ کے اول ہی قدم پر یہ کتابہ لگا دیا گیا

ہشدار کہ رہ بردم تیغست قدم را

اور نہ صرف اول میں بلکہ اور بھی جابجا منزلوں کے سرے پر ایسا کتابہ آویزاں کر دیا کہ مبادا اگر راہ گیر ایک جگہ بھول گیا تو دوسری جگہ ضرور خیال کرے۔

(۴) پس قرآن نے صاف طرح پر اعلان کر دیا " اس دریا سے بقدر اپنے ظرف کے پانی لے لو تمام دریا کو اپنی کاہیا میں بھرنے کی ہوس نہ کرو۔" صحابہؓ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔ اگر کسی جگہ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو خواہ مخواہ اس میں الجھتے نہ تھے۔ یہ اس لئے تھا کہ بقدر ہدایت قرآن نہایت کھلا تھا۔ دریا عبور کر کے اپنی منزل مقصود کو پہنچتے تھے مگر اسکی تمام وسعت کو ناپنے کی تمنا نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ اسے غیر محدود اور ناپیدا کنار جان گئے تھے۔ ہاں ہر شخص بقدر اپنے فہم اور قوت فکر کے اس سے جواہر نکالتا تھا اور عام شاہراہ سے ادھر ادھر جو دلکش جزیرے واقع تھے ان کا انکشاف کرتا تھا جیسا کہ حضرت علیؓ سے منقول ہے " اس دریا کے عجائبات کبھی ختم نہ

ہوں گے۔''

(۵) جو لوگ قرآن کو ایک معمولی کلام خیال کرتے ہیں اور اپنی لیاقت کو جتنی ہے اس سے زیادہ سمجھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ فہم قرآن کے لئے کافی ہے وہ قرآن کے معنی سے بالکل محروم رہتے ہیں، ان میں بعضے اپنی کج فہمی کا نام اعتراض رکھتے ہیں۔ دوسرے مذاہب والے جو قرآن کو کچھ تھوڑا بہت سمجھتے ہیں وہ خود گواہی دیتے ہیں کہ اس کو سمجھنے کے لئے یہ پہلا امر ہے کہ اسے ایک علمی کلام مانا جائے۔

قرآن پاک نے بھی اپنی نسبت مختلف جگہ یہی کہا ہے کہ انکار کرنے والا اس کو ہرگز نہیں سمجھے گا۔ عیسیٰ علیہ السلام سے جب انکے شاگرد نے پوچھا کہ آپ بذریعہ تشبیہات کیوں تعلیم دیتے ہیں تو یہی فرمایا'' تا کہ یہ بات منکروں پر پوری ہو کہ سنتے ہیں اور نہیں سنتے اور دیکھتے ہیں اور نہیں دیکھتے۔'' قرآن اپنی نسبت کہتا ہے کہ'' اس سے بدکاروں کی گمراہی اور بڑھ جاتی ہے'' چنانچہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا کہ حق کو جب ظاہر کیا گیا ہے تو وہ لوگ جو حق کے ماننے کے لئے آمادہ تھے انہوں نے بے تکلف اسے مان لیا اور حق کے راستہ پر چل کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔ جس نے پس و پیش کیا اس نے اپنی منزل کھوئی اور جس نے منہ پھیر لیا وہ اندھا ہو گیا۔ کیونکہ جس عقل کو وہ ہر کام میں اپنا رہنما بناتا تھا۔ جب اسی عقل نے حق کی گواہی دی تو وہ اس سے بیزار ہوا اور کہنے لگا کہ اس کلام میں جادو ہے کہ میری سمجھ الٹی ہوئی جاتی ہے۔ پس عقل پر خواہش کو مقدم رکھا اور لگا فضول شبہے اور بیکار حیلے ڈھونڈنے تا کہ اپنی حماقت پر ذرا پردہ ڈال دے کیونکہ فطرت کو تاریکی سے خود نفرت ہے پس جب اس نے اس طرح عقل کی آنکھ پر پٹی باندھ لی تو ظاہر ہے کہ جو کچھ رہی سہی روشنی تھی اسے بھی کھو بیٹھا، اس حالت کو قرآن پاک نے اکثر جگہ بیان کیا ہے اور انجیل میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔ (۱)''

(۱) تفسیر نظام القرآن : ۵۱۹-۵۲۰

## قرآن مجید کی مشکلات باعتبار مخاطب:

اس باب کے شروع میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایک کلام ایک شخص کے لئے نہایت سہل و آسان ہوتا ہے لیکن وہی کلام دوسرے شخص کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے معاملہ پر اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ عہد رسالت کے مسلمانوں کے لئے قرآن مجید نہایت آسان تھا، وہ آسانیاں بعد کے لوگوں کے لئے باقی نہیں رہیں۔ اپنے ماحول کے احوال وواقعات، اپنے زمانہ کے رسوم وعادات اور اپنی قوم کے اعمال وعقائد سے وہ پوری طرح باخبر تھے۔ قرآن مجید نے جہاں اشارہ کیا فوراً سمجھ گئے۔ یہاں تک کہ ان آیات کا سمجھنا بھی ان کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا، جن میں کسی خاص واقعہ یا کسی شخص کی طرف نہایت مخفی اور لطیف تعریضات ہوتی تھیں کوئی آیت اتری اور اس کے کسی لفظ میں انہوں نے کسی خاص اشارہ، یا تعریض یا کنایہ کی بو پائی اور فوراً اس کے صحیح مصداق کی طرف انگلیاں اٹھادیں اور حرف مطلب تک اس طرح پہنچ گئے گویا اخفاوابہام کے قسم کی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں جن میں ابو لہب کی نسبت نہایت لطیف تعریضات ہیں۔ ان آیات کے اندر جو شخصیت مخفی ہے اس کی طرف صحابہؓ کی نظر جس آسانی کے ساتھ اٹھ سکتی تھی، اس آسانی کے ساتھ ہماری نظر نہیں اٹھ سکتی۔ وہ اس کے خدوخال سے اچھی طرح آشنا تھے۔ اس وجہ سے جوں ہی لسان غیب سے کوئی لفظ تراوش ہوا وہ بے تکلف اس کا مطلب سمجھ گئے۔ بعض آیات میں صحابہؓ میں سے کسی خاص شخص کی مدح یا کسی کے کسی خاص فعل پر مذمت ہے۔ ان کو جس سہولت کے ساتھ عہد نزول قرآن کے لوگ پہچان سکتے تھے ظاہر ہے کہ اس سہولت کے ساتھ بعد کی صدیوں کے لوگ نہیں پہچان سکتے تھے۔

یہی حال اعمال وعقائد کا ہے قرآن مجید میں اس عہد کے اعمال وعقائد کے بیان سے شاید ہی کوئی سورہ خالی ہو لیکن جس طرح معلوم ومشہور باتیں بیان ہوتی ہیں اسی طرح

بالاجمال ان کی طرف اشارات کردئے گئے ہیں، تفصیل کا اسلوب اختیار نہیں کیا گیا ہے مثلاً سورہ انعام میں اہل عرب کے بعض اعمال و معتقدات اس طرح بیان ہوئے ہیں۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَ
الْاَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ
وَهٰذَا لِشُرَكَائِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ
فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ
يَصِلُ اِلٰى شُرَكَائِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ
وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِنَ الْمُشْرِكِينَ
قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَ
لِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا
فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ وَقَالُوا هٰذِهٖ
اَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا اِلَّا مَنْ
نَشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا
وَاَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا
افْتِرَاءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا
يَفْتَرُونَ وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هٰذِهِ
الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰى
اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَكُنْ مَيْتَةً فَهُمْ فِيهِ
شُرَكَاءُ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهُ حَكِيمٌ
عَلِيمٌ. قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا اَوْلَادَهُمْ
سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ

اور خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کئے ہیں
اس میں انہوں نے اللہ کا ایک حصہ مقرر کیا
ہے پس کہتے ہیں: یہ حصہ تو اللہ کا ہے، ان
کے گمان کے مطابق اور یہ حصہ ہمارے
شرکاء کا ہے تو جو حصہ ان کے شرکاء کا ہوتا ہے
وہ تو اللہ کو نہیں پہنچ سکتا اور جو حصہ اللہ کا ہوتا
ہے ان کے شرکاء کو پہنچ سکتا ہے کیا ہی برا
فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں اور اسی طرح بہت
سے مشرکوں کی نظر میں ان کے شرکاء نے ان
کی اولاد کے قتل کو ایک مستحسن فعل بنادیا
تاکہ ان کو تباہ کریں اور تاکہ انکے دین کو
ان کیلئے بالکل گھپلا کردیں اور اگر اللہ چاہتا تو
وہ ایسا نہ کر پاتے تو ان کو چھوڑ دو اپنے اسی
افتراء میں پڑے رہیں اور کہتے ہیں: فلاں
فلاں چوپائے اور فلاں فلاں کھیتی ممنوع ہے
ان کو نہیں کھا سکتے مگر وہی جن کو ہم چاہیں
اپنے گمان کے مطابق اور کچھ چوپائے ہیں
جن کی پیٹھیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں اور کچھ
چوپائے ہیں جن پر خدا کا نام نہیں لیتے۔

اللّٰهُ افْتِرَاءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ.(۱)

محض اللہ پر افتراء کے طور پر اللہ عنقریب ان کو اس افتراء کا بدلہ دے گا اور کہتے ہیں فلاں قسم کے چوپائے کے پیٹ میں جو ہے وہ بس ہمارے مردوں کے لئے خاص ہے اور ہماری عورتوں کے لئے حرام ہے اور اگر وہ مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں عنقریب اللہ ان کو ان کی اس تشخیص کی سزا دے گا بے شک وہ حکیم وعلیم ہے وہ لوگ نامراد ہوئے جنہوں نے محض بے وقوفی سے بغیر کسی علم کے اپنی اولاد کو قتل کیا اور اللہ نے ان کو جو روزی بخشی اس کو اللہ پر افتراء کر کے حرام ٹھہرایا یہ گمراہ ہوئے اور ہدایت پانے والے نہ بنے۔

ان آیات کے اندر اہل عرب کے متعدد توہمات بیان ہوئے ہیں اور انداز بیان اجمالی اشارات کا ہے۔صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو یہ داستان سنائی جارہی ہے وہ اس سے پوری طرح باخبر ہیں۔پس اقتضائے بلاغت یہی تھا کہ اس کی تفصیل نہ کی جائے لیکن بعد والوں کے لئے ،جو اس عہد کے خاتمہ کے بعد آئے ،ان اجمالی اشارات کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ان کے ذہن میں ان کی تفصیلات سے متعلق بہت سے سوالات پیدا ہوں گے جن کے جواب کے لئے اس عہد کے عقائد واعمال سے واقفیت ضروری ہے۔

اس کو ایک دوسری مثال سے بھی سمجھئے سورہ انفال میں فرمایا ہے کہ وَمَا كَانَ

(۱) الأنعام : ۱۳۶ - ۱۴۰

صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاءً وَّ تَصْدِيَةً (۱) (اور بیت اللہ کے سامنے ان کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے سوا کچھ نہیں) آج ہمارے لئے اہل مکہ کی اس عبادت کا صحیح تصور کتنا مشکل ہے لیکن عہد نزول قرآن کے لوگوں کے لئے اس سے زیادہ عام اور معلوم بات کوئی دوسری نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ نہ صرف اس نماز کی پوری ہیئت و حقیقت سے واقف تھے بلکہ ظہور اسلام سے پہلے یہی نمازیں خود پڑھتے رہے تھے۔

ایک اور مثال لیجئے۔ سورہ اعراف میں ہے۔

وَاِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَ نَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا.قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَامُرُ بِالْفَحْشَاءِ اَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُونَ.(۲)

اور جب یہ لوگ کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں کہتے ہیں ہم نے اس طریق پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور خدا نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہہ دو: اللہ کبھی بے حیائی کا حکم نہیں دیتا کیا تم لوگ اللہ پر تہمت جوڑتے ہو جس کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں۔

جو لوگ عہد نزول قرآن میں موجود تھے انہوں نے اس آیت کو اہل مکہ کے ننگے ہو کر طواف کرنے سے متعلق سمجھا حالانکہ اس میں ننگے ہو کر طواف کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک لطیف اشارہ ہے لیکن کلام کا موقع اور سیاق و سباق ایسا تھا کہ جو لوگ اہل مکہ کی اس حالت سے واقف تھے۔ ان کا ذہن اسی مطلب کی طرف جا سکتا تھا۔ البتہ بعد والوں کو یہ مطلب سمجھنے میں زحمتیں پیش آئیں اس لئے کہ ان کے سامنے صرف کلام اور سیاق و سباق تھا۔ وہ موقع اور ماحول نہ تھا جس میں یہ کلام نازل ہوا تھا۔ ہر چند کہ الفاظ اور سیاق کلام صحیح مطلب کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے ناکافی نہیں ہوتے لیکن ان کی

(۱) الانفال : ۳۵

(۲) الأعراف : ۲۸

رہنمائی کے ساتھ اگر موقع ومحل کی رہنمائی بھی شامل ہو جائے تو پھر اصل حقیقت آپ سے آپ بےنقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

اسی آیت سے بالکل متصل فرمایا ہے۔

يٰبَنِي آدَمَ خُذُوا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَ الطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (۱)

اے بنی آدم! ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس پہنو اور کھاؤ پیو البتہ اسراف نہ کرو خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا پوچھو کس نے حرام ٹھہرایا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو؟

یہ آیت بھی مذکورہ بالا مسئلہ ہی سے متعلق ہے۔اس سے ننگے طواف کرنے کا اصلی فلسفہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب کا یہ احمقانہ فعل ان کے بہت سے افعال کی طرح، درحقیقت ایک نیکی پر مبنی تھا۔ یہ بے حیائی انہوں نے اس لئے اختیار کی تھی کہ وہ اس کو رہبانیت اور زہد خیال کرتے تھے ان کے خیال میں لباس ایک شان وتجمل اور زیب وزینت کی چیز ہے۔اس لئے وہ طواف کے وقت اس کو اتار دیتے تھے کہ خدا کے گھر کا طواف ان دنیاوی آلائشوں کی آلودگی سے پاک رہے۔قرآن مجید نے مذکورہ آیت میں ان کے اس خیال کی تردید کی کہ نیکی کا یہ تصور بالکل غلط ہے کہ جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کیلئے پیدا کی ہیں ان کو آدمی اپنے اوپر حرام کرلے۔ان نعمتوں سے متمع ہونا چاہیے کیونکہ ان کے وجود میں لانے کا منشا ہی یہی ہے کہ خدا کے بندے ان سے متمع ہوں۔البتہ اسراف ناجائز ہے اس سے بچنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کے صحیح زور کو سمجھنا اس امر پر منحصر ہے کہ طواف عریاں کا یہ فلسفہ سامنے ہو۔یہ فلسفہ آیت کے الفاظ سے اگرچہ مترشح ہو رہا ہے۔ بلکہ بغیر اس کو مانے ہوئے آیت کی کوئی جمتی ہوئی تاویل ناممکن ہے۔لیکن الفاظ میں اس قدر عموم ہے کہ اگر یہ بات سامنے نہ ہو اور موقع کلام اس کی طرف رہبری نہ کرے تو اس مطلب تک پہنچنے میں دقتیں

(۱) الاعراف: ۳۱-۳۲

پیش آئیں گی۔ لیکن جن کے سامنے یہ فعل اور یہ فلسفہ دونوں موجود تھے ان کو اس آیت کے سمجھنے میں کیا دقت ہو سکتی تھی۔ خود اپنی حکایت تھی، ادھر الفاظ زبان سے نکلے ادھر تمام حقیقت آئینہ ہو کر سامنے آگئی۔ اسی طرح سورہ بقرہ میں جہاں احکام حج بیان ہوئے ہیں، فرمایا ہے:

| | |
|---|---|
| فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُو اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَائَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْراً (۱) | پھر جب تم حج کے مناسک ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح تم پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ |

سلف سے اس آیت کی جو تاویل ہم تک پہنچی ہے اس میں کذکرکم آباءکم کی تفصیل میں وہ فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| وكانوا اذا قضوا مناسكهم وقفوا بين المسجد بمنى و بين الجبل فيعددون فضائل آباءهم و يذكرون محاسن ايامهم. (۲) | مناسک حج سے فارغ ہو کر لوگ مسجد اور پہاڑ کے درمیان بیٹھ جاتے اور اپنے آباء واجداد کے مفاخر اور کارنامے بیان کرتے۔ |

اگر چہ آیت کے الفاظ مذکورہ بالا تفصیل کی طرف اشارہ کرر ہے ہیں۔ لیکن اس اشارہ کو سمجھنا ان لوگوں کے لئے بہت آسان نہیں ہے جو موقع کی اس خصوصیت اور عرب کے مذاق سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ البتہ جو لوگ عہد نزول قرآن میں موجود اور ان حالات سے باخبر تھے ان کے لئے اس کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں تھا۔

اسی طرح کسی عہد کا کلام اس عہد کی بیشمار تمدنی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ اور اس کا اصلی حسن اور اصلی زور اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتا جب تک اس کلام کا ماحول اپنے اردگرد نہ پیدا کر لیا جائے۔ مثلاً ایک مقام پر فرمایا ہے:

(۱) البقرة : ۲۰۰

(۲) الکشاف : ۱/ ۳۴۹-۳۵۰

| | |
|---|---|
| اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْثَانًا مَوَدَّۃَ بَیْنِکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ثُمَّ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَکْفُرُ بَعْضُکُمْ بِبَعْضٍ وَ یَلْعَنُ بَعْضُکُمْ بَعْضًا وَمَأْوٰکُمُ النَّارُ وَمَا لَکُمْ مِنْ نَاصِرِیْنَ. (۱) | تم نے اللہ کے سوا جو بت بنائے ہیں تمہاری آپس کی دوستی بس دنیا کی زندگی تک ہے۔ پھر قیامت کے دن تم میں سے ہر ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ |

اس آیت میں ''مَوَدَّۃَ بَیْنِکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا'' کے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اس میں اس عہد کی سیاست کی ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، جس کے سمجھے بغیر آیت کی صحیح تاویل کے بعض نہایت اہم پہلو بے نقاب نہیں ہوتے۔

عرب اور دوسری بہت سی بت پرست اقوام میں، بت پرستی محض ایک مذہبی عمل و اعتقاد ہی کی حیثیت سے نہیں تھی بلکہ ان کے تمام سیاسی اور اجتماعی رشتے بھی اسی چیز سے وابستہ تھے۔ قبیلہ قبیلہ کے الگ الگ اصنام تھے اور دستور تھا کہ جب کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ کے ساتھ اتحاد کرنا چاہتا تو اس کے بت کی پرستش میں اس کے ساتھ شریک ہو جاتا اور جب اس سے قطع تعلق کرنا چاہتا، اس شرکت سے علیحدگی کا اعلان کر دیتا، اس کے بعد آپس کے تمام سیاسی تعلقات ختم ہو جاتے۔ غور کیجئے جن لوگوں کے سامنے یہ حقیقت موجود تھی ان کو آیت کے اس ٹکڑے کے سمجھنے میں کیا دقت پیش آسکتی تھی، سنا اور فوراً سمجھ گئے۔ لیکن ہم، جب تک اس عہد کی سیاسیات سے فی الجملہ واقف نہ ہوں، ان لفظوں کا حقیقی زور کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟

اس حقیقت کی توضیح کے لئے ایک عمدہ مثال سورہ بقرہ کی وہ آیت بھی ہے جو شراب اور جوئے کی ممانعت سے متعلق ہے۔

| | |
|---|---|
| وَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ قُلْ فِیْھِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ | وہ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ ان دونوں |

(۱) العنکبوت :۲۵

اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا (۱) کے اندر بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے۔

اس آیت کی نسبت ایک غلط فہمی بہت عام ہے۔لوگ سمجھتے ہیں کہ خمر و میسر کی جس منفعت کا قرآن نے اعتراف کیا ہے وہ ان کی طبی اور ذاتی منفعت ہے حالانکہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی۔قرآن نے جس منفعت کا اعتراف کیا ہے، وہ ان کی تمدنی، اخلاقی اور معاشرتی منفعت ہے۔کسی چیز کی طبی اور ذاتی منفعت اولا تو قرآن کے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ثانیا اگر شراب میں کچھ فوائد ہوں بھی تو دنیا کی کون سی مضر سے مضر شے ایسی ہے جس میں کوئی پہلو فائدہ کا نہیں ہے، پھر شراب اور جوئے ہی کی کیا خصوصیت تھی کہ قرآن نے ان کو حرام کرتے ہوئے ان کے نفع بخش اور مفید ہونے کا اعتراف کیا۔دوسری بہت سی چیزیں حرام کیں، کیا وہ فوائد سے مطلقا خالی تھیں؟ پھر ان کی نسبت یہ اعتراف کیوں نہیں کیا؟ کیا سور میں فائدہ کا کوئی پہلو نہیں تھا؟

ہمارے نزدیک یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس غلطی کو رفع کرنے کے لئے آیت میں ''نفع'' اور ''اثم'' کا تقابل بالکل کافی ہے۔اگر مقصود ان کے طبی اور ذاتی فوائد و نقصانات کی طرف اشارہ کرنا ہوتا تو ''نفع'' کے مقابل میں ضرر یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ آتا ''اثم'' کا لفظ نہ آتا جو عربی زبان میں جسمانی ضرر کے مفہوم کے لئے نہیں بلکہ اخلاقی گناہ کیلئے بولا جاتا ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ شراب اور جوئے کے طبی و ذاتی منافع کا معاملہ تو آسان تھا کہ اس کے بعض پہلو معلوم تھے لیکن ان کے تمدنی اور اخلاقی فوائد کیا ہیں جن کا قرآن نے اعتراف کیا ہے؟ اس سوال کا جو صحیح جواب ہے اس کا باور کرنا آج کل کے

(۱) البقرۃ : ۲۱۹

لوگوں کیلئے مشکل ہے کیونکہ ہمارے سامنے جو میخواری اور قمار بازی ہے وہ سرتا سر ضرر وفساد ہی ہے اس میں فائدہ کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں ہے۔ وہ جسم اور روح، فرد اور سماج سب کیلئے یکساں لعنت ہے۔ البتہ عربوں میں میخواری اور قمار بازی کو تمدنی اور اخلاقی اعتبار سے ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ ان کی سوسائٹی میں یہ دونوں برائیاں نیکی کی راہ سے داخل ہوئی تھیں۔ وہ ان دونوں چیزوں کو فیاضی اور کرم گستری کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے، اس لئے ان لوگوں کو نہایت نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جو شراب اور جوئے سے بچتے تھے۔ جو لوگ اس عہد کی تہذیب سے واقف ہیں وہ ہمارے اس بیان کا انکار نہیں کر سکتے۔ کسی جاہل شاعر کے چند شعر پڑھیے وہ ان ہی دونوں چیزوں کو، جن کو آپ سوسائٹی کی سب سے بڑی برائی خیال کرتے ہیں سب سے بڑی نیکی کی حیثیت سے ذکر کرے گا اس لئے کہ دوستوں کی مدارات، غریبوں کی ہمدردی، بیواؤں کی سرپرستی اور یتیموں کی اعانت کا سب سے بڑا ذریعہ ان کے یہاں یہی چیزیں تھیں۔

عرب کے فیاض اور رند مشرب لوگوں کا یہ قاعدہ تھا کہ جاڑوں کے موسم میں جب کہ عرب میں قحط کا زمانہ ہوتا تھا شراب نوشی کی مجلسیں منعقد کرتے اور شراب کی بدمستی میں نہایت قیمتی اونٹوں کو ذبح کر دیتے اور پھر ان کے گوشت کی ڈھیریاں لگا کر ان پر جوا کھیلتے اور جو گوشت جیتتے اس کو غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ دیتے۔

جوئے اور شراب کے یہی فضائل تھے جن کی بنا پر قرآن میں جب ان کی حرمت کے احکام نازل ہوئے تو لوگوں کو تعجب ہوا کہ اتنی مفید چیزیں اسلام نے حرام کیوں ٹھہرا دیں؟ قرآن نے ان لوگوں کے جواب میں اس امر کا تو اعتراف کیا کہ شراب اور جوئے میں بعض تمدنی فوائد ضرور ہیں لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ظاہر کر دی کہ ان کے تمدنی نقصانات کا پہلو ان کے فوائد کے مقابل میں غالب ہے اس وجہ سے ان کو حرام ٹھہرایا جا رہا ہے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن مجید نے خمر و میسر کا تذکرہ فیاضی کی تعلیم کے

سلسلہ میں کیا ہے جو اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ اہل عرب میں یہ چیزیں رذائل میں نہیں بلکہ فضائل میں داخل تھیں۔ اور انہوں نے ان کو محض عیاشی اور لہو ولعب کے طور پر نہیں اختیار کیا تھا بلکہ سوسائٹی کی ایک بہت بڑی عزت سمجھ کر اختیار کیا تھا(۱)۔

اب غور کیجئے کہ جن لوگوں کو یہ تمام داستان معلوم تھی ان کے لئے قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ کی اصل حقیقت تک پہنچ جانا کیا مشکل تھا؟ لیکن بعد کے زمانوں میں جب یہ تمام باتیں نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں تو تاویل کا یہ رخ آخر لوگوں کے سامنے کس طرح آسکتا تھا؟

اس حقیقت کی مزید وضاحت مطلوب ہو تو سورہ نور میں دیکھئے۔ اس میں اصلاح معاشرت کے بہت سے احکام بیان ہوئے ہیں۔ بظاہر ان کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔ لیکن جب ڈوب کر مطالب پر غور کرنے کی کوشش کیجئے تو اس عہد کے معاشرتی حالات کے متعلق طبیعت میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلام، اپنی وضاحت کے لئے، ان معلومات کا منتظر ہے۔ یہاں تک کہ بعض مواقع پر، جب تک

(۱) چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:۔

زہیر کا قول ہے:

أخی ثقة لا تتلف الخمر ماله ولكنه قد يهلك المال نائله

(دیوان زہیر بن ابی سلمی ص ۶۸)

عنترة بن شدّاد کہتا ہے:

فإذا شربت فإننی مستهلک مالی وعرضی وافر لم یکلمه

وإذا صحدت فما أقصر عن نوی وكما علمت شمائلي وتكرمي

(شرح القصائد العشر ۲۳۴)

مجرب خالد کا شعر ہے:

و إذا هلكت فلا تريدی عاجزاً ولابربا وعنسا ولا مزالا

(شرح القصائد العشر ۷۲)

حالات کی پوری تفصیل سامنے نہ آجائے، طبیعت کی خلش دور نہیں ہوتی۔سورہ برأت وغیرہ کے سمجھنے کیلئے اس عہد کے سیاسی تغیرات وانقلابات اوران تمام سیاسی ومذہبی پارٹیوں کو جاننا ضروری ہوتا ہے جو اسلام کے ظہور نے پیدا کر دی تھیں۔

غرض ہر عہد کے کلام میں اس عہد کے تمدن اخلاق، سیاست اور مذہب کی ایسی حقیقتیں مضمر ہوتی ہیں جن سے مطلع ہوئے بغیر اس کلام کی بہت سی خوبیاں اور باریکیاں سمجھ میں نہیں آتیں۔اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ہر کلام کا حال یہی ہے۔ہومر اور شکسپیر کو پوری طرح سمجھنے کیلئے ہم کو یہی کام کرنا پڑتا ہے کہ بے شمار خارجی چیزوں کی مدد سے ہم اپنے اردگرد ہومر اور شکسپیر کا ماحول تیار کرتے ہیں۔ہومر اور شکسپیر تو خیر زمانہ قدیم کے فسانے ہیں، ان کے تمدن اور ہمارے تمدن میں نہ صرف زمانہ کا فرق ہے بلکہ دونوں کی اصل ونسل اور وطن ومرز بوم بھی مختلف ہیں۔میرؔ اور غالبؔ کو لیجئے جو اپنی ہی قوم کے شاعر تھے اور ابھی ان کے کلام پر کچھ ایسا زمانہ بھی نہیں گذرا ہے کہ ان کے سمجھنے کیلئے ہم ان چیزوں کے محتاج نہیں ہوتے؟

الاصلاح (۱) میں استاد امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مضمون ''ترتیب ونظام قرآن'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس کی مندرجہ ذیل سطریں نہایت غور سے پڑھنے کے قابل ہیں:

(۱) ہم کو لازم ہے کہ زمانہ نزول قرآن کی پوری حالت تمدن سے ہم واقف ہوں۔

(۲) ہم کو اس وقت کے یہود ونصاریٰ، مشرکین وصابئین وغیرہ کے مذہب ومعتقدات سے واقف ہونا چاہیے۔

(۳) ہم کو عرب کے عام توہمات کو دریافت کرنا چاہیے۔

(۴) ہم کو جاننا چاہیے کہ نزول قرآن کی مدت میں کیا کیا واقعات نئے پیدا ہوئے اور ان سے عرب کی مختلف جماعتوں میں کیا کیا مختلف باتیں زیر بحث آگئیں۔کیا

(۱) دائرہ حمیدیہ کا ماہوار رسالہ جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک جاری رہا اور پھر بند ہو گیا۔

کیا ملکی وتمدنی جھگڑے چھڑ گئے اور تمام عرب میں کیا شورش پیدا ہوگئی۔

(۵) ہم کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ عرب کا مذاق سخن کیا تھا۔ کس قسم کے کلام سننے اور بولنے کے وہ عادی تھے، بزم میں ان کا خطیب کس روش پر چلتا تھا۔ ایجاز اور اطناب، ترصیع وترکیب ودیگر اسالیب خطابت کو وہ کیوں کر استعمال کرتے تھے۔

(۶) اور بالآخر ہم کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ عرب کے ذہن میں اخلاق کے مدارج نیک وبد کیا تھے۔(۱)

## سلف کا طریقۂ تفسیر:

انہی وجوہ سے سلف کا طریقۂ تفسیر یہ رہا ہے کہ پہلے وہ قرآن کو خود قرآن کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے، اس کے بعد اگر کوئی مشکل باقی رہ جاتی تو اس کا حل رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال میں تلاش کرتے۔ اس کے بعد بھی اگر معاملہ کا کوئی گوشہ محتاج توضیح رہ جاتا تو اس کے لئے صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار واقوال سے مدد لیتے کیونکہ قرآن مجید جن لوگوں کے حالات وواقعات پر اترا اور جن کو اس نے سب سے پہلے مخاطب کیا وہ قرآن مجید کے اسرار وحکم اور اسکے رموز وحقائق کو جس خوبی کے ساتھ سمجھ سکتے تھے اس خوبی کے ساتھ دوسرے لوگ، جن کو وہ حالات میسر نہیں ہیں، کسی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ علامہ سیوطی اتقان میں تفسیر کا طریقہ یہ بتاتے ہیں۔

قال العلماء من اراد تفسير الكتاب العزيز طلبه اولا من القرآن فما اجمل منه في مكان فقد فسر في موضع اخر وما اختصر في مكان فقد بسط في موضع اخر منه وقد الف ابن الجوزي كتابا فيما اجمل

علماء نے کہا ہے کہ جو شخص قرآن مجید کی تفسیر کرنا چاہے وہ قرآن مجید سے تفسیر کرے۔ اس میں جو چیز ایک جگہ مجمل ہے دوسری جگہ اس کی تفسیر کردی گئی ہے اور جو بات ایک جگہ مختصر ہے، دوسرے مقام پر بالکل مفصل ہے۔ ابن جوزی نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں

(۱) الاصلاح ۱/۱/۴-۵ نیز قرآنی مقالات ص

فی القرآن وفسر فی موضع اخر منه وقد اشرت الیٰ امثلة منه فی نوع المجمل فان اعیاه ذلک طلبه من السنة فانها شارحة للقرآن و موضحة له وقد قال الشافعی رضی الله عنه کلما حکم به رسول الله ﷺ فهو مما فهمه من القرآن. قال الله تعالیٰ انا انزلنا الیک الکتٰب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک الله فی آیات اخر وقال ﷺ الا انی اوتیت القرآن و مثله معه یعنی السنة فان لم یجده من السنة رجع الی اقوال الصحابة فانهم ادری بذلک لما شاهدوه من القرائن و الاحوال عند نزوله ولما اختصوا به من الفهم التام و العلم الصحیح ،و العمل الصالح.(۱)

قرآن کی ان تمام آیات سے تعرض کیا ہے جو ایک جگہ مجمل اور دوسری جگہ مفصل ہیں ۔اور میں نے خود مجمل کے بیان میں اس کی بعض مثالوں کی طرف اشارہ کیا ہے ۔اگر کہیں اس میں کامیابی نہ ہو(یعنی قرآن کی تفسیر خود قرآن سے نہ ہو سکے ) تو سنت میں اس کی تفسیر تلاش کرے ، کیونکہ سنت قرآن کی شارح اور مفسر ہے حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ آنحضرت صلعم کے تمام فیصلے قرآن مجید سے مستنبط ہیں ۔اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری تا کہ تم لوگوں کے درمیان اسی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھایا ہے آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے۔ مجھے قرآن دیا گیا اور اسی کے مثل اس کے ساتھ یعنی سنت ،پس اگر سنت میں بھی نہ پائے تو صحابہؓ کے اقوال کی طرف متوجہ ہو، وہ اس کے سب سے بڑھ کر جاننے والے ہیں ۔اس لئے کہ انہوں نے نزول قرآن کے وقت تمام قرائن و حالات کا خود مشاہدہ کیا ہے ۔نیز فہم کامل اور علم صحیح وعمل صالح سے بھی آراستہ تھے۔

(۱) الاتقان: ۱۱۹۷/۲

تفسیر کا یہ طریقہ بالکل فطری ہے۔اصلی چیز خود قرآن کے الفاظ اور اس کی اپنی توضیحات ہیں، اس کے بعد آنحضرت صلعم کی سنت ہے اور تیسرا درجہ اقوال صحابہ کا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جو لوگ آنحضرت ﷺ کی تشریحات اور صحابہؓ کے اقوال کی روشنی میں قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں، وہ قرآن کے الفاظ کی حکومت باطل نہیں کرنا چاہتے۔ہم نے اوپر جو قول نقل کیا ہے اس میں تفسیر کے لئے اصل الاصول خود قرآن مجید کے الفاظ اور اس کی توضیحات ہی کو قرار دیا گیا ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضا. ہاں اگر کوئی بات ایسی ہے جو خود قرآن مجید سے صاف نہیں ہو رہی تو اس کے لئے آدمی کہاں جائے؟ ایک آزاد خیال سے آزاد خیال آدمی بھی اس سوال کا جواب یہی دے گا کہ ایسی مشکلات میں بہترین رہنمائی سنت رسولؐ اور اقوال صحابہؓ کی رہنمائی ہی سے ہو سکتی ہے اس لئے کہ جس پر قرآن اترا اور جن لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لئے اترا وہ اس کو جس قدر بہتر سمجھ سکے دوسرے اس قدر بہتر نہیں سمجھ سکتے۔لیکن اس رہنمائی کی صورت کیا ہوگی؟ یہ ہوگی کہ ایک آیت او ر اس کے الفاظ کی روشنی میں پوری طرح غور کیا۔قرآن مجید میں جو آیات اس کی مماثل ہیں، ان کی روشنی میں بھی اس کو اچھی طرح دیکھ لیا۔سیاق و سباق اور عمود و نظم کے پہلو سے بھی اس پر نگاہ ڈال لی لیکن ان تمام باتوں کے بعد پوری تشفی نہیں ہوتی۔الفاظ کچھ چاہتے ہیں لیکن صاف نہیں معلوم ہوتا کہ کیا چاہتے ہیں؟ اب ہم احادیث اور اقوال صحابہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کوئی ایسی بات پالیتے ہیں جس سے اس آیت کا تمام عالم روشن ہو جاتا ہے، الفاظ کو اس کے بعد کسی بات کا انتظار نہیں رہ جاتا، نظم اور سیاق کلام سب کا حق ادا ہو جاتا ہے تو اس بات کو، اگر وہ صحیح طریقہ سے منقول ہوگی، قبول کر لیں گے۔یہ نہیں کریں گے کہ آیات کے الفاظ کسی توضیح و تشریح کے منتظر ہوں یا نہ ہوں لیکن ایک بات، جو ہم نے روایات کے ذخیرہ میں دیکھ لی ہے، خواہ مخواہ اس پر چسپاں کر دیں اگرچہ نظم و سیاق، آیت مماثل اور نصوص کتاب و سنت سب اس کے علانیہ مخالف ہوں، اسی قسم کے غلو نے لوگوں میں احادیث و آثار کی طرف سے بدگمانی پیدا کی اور وہ خیالات پھیلے جن کا صدر

مضمون میں ہم حوالہ دے چکے ہیں ۔اہل تحقیق کا یہ مذہب کبھی نہیں رہا ہے۔انہوں نے تفسیر قرآن کے معاملہ میں ہمیشہ قرآن مجید ہی کو مقدم رکھا۔ ہاں اگر کوئی مقام محتاج توضیح ہوا اور صحیح احادیث اور ثابت آثار سے اس کی تشریح ہوگئی تو اس سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کے جائز ہونے پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہوسکتا۔

اب صرف یہ بات رہ گئی کہ یہ احادیث وآثار صحیح و ثابت ہوں، ضعیف وموضوع نہ ہوں۔سو یہ ایک ایسی بات ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ ہمارے علماء نے خود اس بات پر نہایت اہمیت کے ساتھ توجہ دلائی ہے۔اتقان میں ہے۔

| | |
|---|---|
| لطلب التفسير مآخذ كثيرة أمهاتها اربعة. الاول هذا النقل عن النبي ﷺ وهذاهو الطراز المعلم لكن يجب الحذر من الضعيف منه و الموضوع فانه كثير ولهذا قال احمد ثلاث كتب لا أصل لها: المغازي و الملاحم و التفسير. (۱) | تفسیر کے بہت سے ماخذ ہیں جن میں سے چار اصول کی حیثیت رکھتے ہیں ۔اول وہ نقل ہے جو آنحضرت صلعم سے مروی ہے اور یہی مقدم ترین ہے لیکن اس باب میں ضعیف وموضوع سے احتراز واجب ہے کیونکہ اس قسم کی روایات بہت ہیں ۔اسی وجہ سے امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے، تفسیر ومغازی اور ملاحم۔ |

یہ کوئی نہیں کہتا کہ رطب و یابس ہر قسم کی روایات پر اعتماد کرلیا جائے، سب یہی کہتے ہیں کہ پوری تحقیق وتنقید کے بعد جو روایات قابل قبول نکلیں اور روایت و درایت کے تمام اصولوں پر جانچنے کے بعد پکی ثابت ہوجائیں، صرف وہی روایات لی جائیں۔ہم ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ رائے رکھتے ہیں کہ صحیح روایات اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید کی بہترین تفسیر روایات صحیحہ، آثار ثابتہ اور سنن متواترہ کے اندر محفوظ ہے۔آنحضرت ﷺ

(۱) الإتقان ۲/۱۲۰۴

نے جو کچھ کیا اور جو کچھ فرمایا سب سرتاسر قرآن سے ماخوذ ہے۔ اوپر ضمناً امام شافعیؒ کا قول نقل ہو چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جتنے فیصلے فرمائے سب قرآن مجید سے ماخوذ ہیں ۔قال الشافعی رضی اللہ عنہ کلما حکم بہ رسول اللہ ﷺ فھو مما فھمہ من القرآن (۱) (آنحضرت صلعم نے جتنے فیصلے فرمائے سب قرآن مجید سے ماخوذ ہیں) ایسی حالت میں قرآن اور حدیث میں تعارض کیونکر ہو سکتا ہے؟ عموماً لوگ احادیث کے ذخیرہ میں سے صرف اتنے ہی حصہ کو قرآن سے متعلق سمجھتے ہیں جو ابواب تفسیر کے عنوان سے درج ہوتا ہے، بقیہ کو قرآن سے غیر متعلق خیال کرتے ہیں حالانکہ حدیث سرتاسر فہم قرآن ہے۔ احادیث پر اگر دقت نظر کے ساتھ غور کیا جائے تو حدیث و قرآن کا گہرا تعلق نہایت واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔

تاہم حدیث کی حیثیت اصل کی نہیں ہے، فرع کی ہے۔ اصل قرآن مجید ہی ہے وہ جس طرح تمام کتب سابقہ کے لئے کسوٹی ہے اسی طرح تمام کتب مابعد کے لئے بھی کسوٹی ہے۔ اگر کسی روایت اور آیت میں تعارض ہوگا تو آیت کی تاویل نہیں کی جائے گی، روایت کی تاویل کی جائے گی، آیت اپنی جگہ بدستور قائم رہے گی۔ ہمیشہ سے اہل تحقیق کا یہی مذہب رہا ہے نسخ کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب تمام کتب اصول فقہ میں مذکور ہے کہ ان کے نزدیک سنت قرآن مجید کی کسی آیت کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ گرچہ اس رائے سے اختلاف رکھنے والوں نے ان پر اس مسئلہ کی وجہ سے بڑی نکتہ چینی کی ہے، یہاں تک کہ شارح مسلم الثبوت نے اس کو مکابرت تک کہہ دیا ہے لیکن مذہب حق یہی ہے۔

امام صاحب کے دلائل اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں، اصول میں خود انکا بھی رسالہ ہے جس میں انہوں نے اپنے مسلک کے دلائل بیان کئے ہیں۔ علامہ آمدی نے بھی اپنی کتاب میں ضروری تفصیل کی ہے بلکہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر اہل ظاہر کا

(۱) مجموع فتاوی شیخ الاسلام ۱۳/۳۶۳

یہی مذہب بتایا ہے پھر تعجب ہے کہ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل کا یہ مذہب ہے جو حدیث و روایت میں صاحب البیت (گھر کے بھیدی) کا درجہ رکھتے ہیں تو فقہاء اور متکلمین کا مذہب اس سے الگ کیوں ہو۔

بہر حال اگر حدیث کو اس درجہ میں رکھ کر قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ان سے قرآن کے سمجھنے میں نہایت قیمتی مدد ملے گی۔ کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوگی۔ ہمارے نزدیک احادیث کو اس درجہ سے بڑھانا زیادتی ہے، اور اس سے گرانا انتہائی بدبختی اور محرومی ہے۔ جو لوگ آج احادیث سے بے پروا ہو کر قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں انکی مثال اس پر جوش اور الھڑ نوجوان کی ہے جو سمندر میں بغیر کشتی کے پھاند پڑا ہے اور خیال کرتا ہے کہ پیر کر سمندر پار کر جائے گا۔ یہ اپج قابل داد ہے لیکن یہ کھلی ہوئی خودکشی ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا۔

## شانِ نزول:

اوپر روایات و آثار پر ہم نے جو اصولی بحث کی ہے وہ روایات اور قرآن مجید کے تعلق کو پوری طرح واضح کر دینے کے لئے بالکل کافی ہے لیکن خاص طور پر شان نزول سے متعلق بعض شبہات لوگوں کے دلوں میں ایسے بھی پیدا ہوتے ہیں جن کے ازالہ کے لئے ضروری ہے کہ اس اصولی بحث سے الگ ہو کر چند سطریں مسئلہ کے خاص حالات کو پیش نظر رکھ کر بھی لکھ دی جائیں۔

تفسیروں کے مطالعہ میں ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ تقریباً ہر آیت کے ذیل میں کوئی نہ کوئی واقعہ بطور شان نزول بیان ہوتا ہے بلکہ بعض آیات کے تحت متعدد واقعات ہوتے ہیں اور ان میں بسا اوقات باہم دگر اختلاف بلکہ کھلا ہوا تضاد ہوتا ہے اور عموماً یہ واقعات ایسے تعجب انگیز اور آیت کے سیاق وسباق سے اس قدر بے تعلق ہوتے ہیں کہ طبیعتیں ان کو قبول کرنے سے جھجکتی ہیں۔ لوگوں کو اس طرح کی روایات پر دو قسم کے شبہات

ہیں۔ایک یہ کہ ان واقعات میں سے اکثر واقعات ایسے ہیں جن کو آیات سے کوئی تعلق نہیں۔دوسرا یہ کہ اگر ہر آیت سے متعلق ایک یا چند واقعات بطور شان نزول تسلیم کر لئے جائیں تو قرآن مجید میں نظم و تسلسل کی تلاش بالکل بے فائدہ ہے کیونکہ نظم کلام کے تسلسل کو چاہتا ہے اور ہر آیت کا کسی خاص واقعہ سے متعلق ہونا تسلسل کے بالکل منافی ہے۔یہ شبہ سورہ انعام کی تفسیر میں حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی پیدا ہوا اور وہ اس کا کوئی تشفی بخش جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئے۔آیت واذا جاءک الذین یومنون بآیاتنا کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ولی ھھنا اشکال وھو ان الناس اتفقوا علیٰ ان ھذہ السورۃ نزلت مرۃ واحدۃ واذا کان الأمر کذلک فکیف یمکن أن یقال فی کل واحدۃ من آیات السورۃ ان سبب نزولھا ھذا الامر الفلانی بعینہ.(۱)

میرے سامنے یہاں ایک سخت اشکال ہے وہ یہ کہ لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی۔جب معاملہ یوں ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ سورہ کی ہر آیت کی نسبت یہ کہا جائے کہ اس کے نزول کا سبب فلاں واقعہ ہے؟

جہاں تک پہلے شبہ کا تعلق ہے،اس کے ازالہ کے لئے اوپر کے بعض مباحث کافی ہیں۔یعنی تفسیر کے لئے صحیح اصول یہ ہے کہ روایات سے پہلے نفس آیت کے الفاظ اور سیاق وسباق پر تدبر کرنا چاہیے۔اگر الفاظ اپنے مفہوم کو پوری وضاحت کے ساتھ ادا کر رہے ہیں،آیت کی صحیح تاویل ،بغیر کسی خارجی مدد کے بالکل بے نقاب ہوگئی ہے نظم ،عمود اور حسن تاویل کے جملہ شرائط پوری طرح ادا ہو گئے ہیں تو کچھ ضروری نہیں ہے کہ ایک ایسے واقعہ کو آیت پر چسپاں کیا جائے جو اس کے نظم وسیاق کو درہم برہم اور اس کے حسن تاویل کو مجروح کرنے والا ہو۔ہاں اگر شان نزول آیت کی واضح اور صحیح تاویل کی تائید کر رہا ہے تو وہ مزید اطمینان اور شرح صدر کا باعث ہوگا اس کو نظر انداز کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔اس کو مثال سے یوں

(۱) التفسیر الکبیر ۱۳/۲_۳

سمجھنا چاہیے کہ جس طرح ایک طبیب ایک نسخہ کو دیکھ کر اور اس کے اجزاء اور ان کی باہمی ترکیب پر غور کرکے پتہ لگالیتا ہے کہ وہ کس مرض کے لئے لکھا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کے طالب علم کو آیت کے مطالب اور ان کی باہمی ترتیب و ترکیب پر تدبر کرکے سورہ کا شان نزول خود سورہ سے معلوم کرنا چاہیے اور پھر مزید بصیرت اور طمانیت کے لئے ان واقعات پر غور کرنا چاہیے جو بطور شان نزول اس آیت کے تحت بیان کئے گئے ہیں۔ اس صورت میں کمزور و ضعیف روایات سے لغزش کا اندیشہ نہیں ہے۔ قرآن مجید کی روشنی صحیح راستہ کی طرف خود رہبری کردے گی۔ جو روایتیں صحیح ہوں گی وہ بجائے کوئی خلجان اور تشویش پیدا کرنے کے شرح صدر اور اطمینان قلب پیدا کریں گی اور جو روایتیں ضعیف ہوں گی وہ خود بخود سامنے سے ہٹ جائیں گی۔

اوپر حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے جس شبہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ شبہ بھی کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔ اہل تحقیق کے جوابات سے۔ جو اصول تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں، اس کا پوری طرح ازالہ ہو جاتا ہے، علامہ سیوطی اس قسم کے شبہات کے جواب میں فرماتے ہیں۔

قال الزركشیؒ فی البرهان قد عرف من عادة الصحابة و التابعين ان احدهم اذا قال نزلت هذه الآية فی كذا فانه يريد بذلك انها تتضمن هذا الحكم لا ان هذا كان السبب فی نزولها فهو من جنس الاستدلال علىٰ الحكم بالآية لا من جنس النقل لما وقع. (۱)

زرکشیؒ نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہؓ و تابعین کا یہ طریقہ عام ہے کہ ان میں سے جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ 'یہ آیت فلاں بارے میں نازل ہوئی' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس بات کا بھی حکم موجود ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ بات بعینہ اس کے نزول کا سبب ہے۔ گویا یہ اس آیت سے اس معاملہ پر ایک استدلال ہوتا ہے نہ کہ نقل واقعہ۔

(۱) الاتقان : ۱/۱/۱۰۱

اس باب میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق بھی یہی ہے۔ وہ الفوز الکبیر میں فرماتے ہیں:

”آنچہ از استقرائے کلام صحابہ و تابعین معلوم می شود آنست کہ نزلت فی کذا نہ محض برائے قصہ کہ در زمان آنحضرت صلعم بودہ و سبب نزول آیت گشتہ استعمال کنند بلکہ گاہے یکے از ما صدق علیہ آیت را کہ در زمان آنحضرت ﷺ بودہاست یا بعد ازاں حضرت ذکر کنند و گوئند نزلت فی کذا ودرینجا انطباق جمیع قیود لازم نیست بلکہ اصل حکم می باید کہ منطبق باشد پس بس و گاہے سوالے کہ آنحضرت ﷺ آوردہ باشند یا حادثہ کہ دراں ایام نیک فرجام متحقق شدہ باشند و آنحضرت ﷺ حکم آں را از آیتے استنباط کردہ باشند و آں آیت را درآن باب تلاوت نمودہ باشند تقریر نمائند و نزلت فی کذا و گاہے دریں صورت ہا گویند فانزل اللہ تعالیٰ قولہ کذا یا فنزلت گویا ایں اشارت بآں سمت کہ استنباط آنحضرت ﷺ ازاں آیت والقائے آن آیت درآں ساعت بخاطر مبارک آنحضرت ﷺ نیز نوعے از وحی و نفث فی الروع ست ازیں جہت میتواں گفت فانزلت واگر کسی دراینجابتکرار نزول تعبیر کند نیز می تواند شد و محدثین د رذیل آیات قرآن چیز ہائے بسیار تقریر می کنند کہ بہ حقیقت نہ از قسم سبب نزول باشد مثل استشہاد صحابہ در مناظرات خود بآیت یا تمثیل ایشاں بآیت یا تلاوت آنحضرت ﷺ آیت را برائے استشہاد کلام خود یا روایت

حدیثے کہ موافق آیت باشد دراصل غرض یاتعیین موضع نزول یا تعیین اسماء مذکورین بطیریق ابہام یاطریق تلفظ کلمہ قرآنیہ یا فضل سور و آیت قرآن یاصورت امتثال آنحضرت ﷺ بامرے ازا و امر قرآن و ایں ہمہ درحقیقت از اسباب نزول ست و شرط مفسر احاطہ بآں نیست۔"(۱)

حضرات صحابہ وتابعین کے کلام پرغور وفکر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ فرمانا کہ یہ آیت فلاں بارہ میں نازل ہوئی کسی ایسے واقعہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہوتا جو عہد نبوی میں واقع ہوکر نزول وحی کا سبب بنا، بلکہ ان کا معمول یہ ہے کہ وہ ایسے واقعات کا جو آیت کے مطالب سے مطابقت رکھتے ہوں قطع نظر اس سے کہ وہ عہد نبوی میں وقوع پذیر ہوئے ہوں یا اس کے بعد، ذکر کر کے کہہ دیتے ہیں کہ یہ فلاں کے بارہ میں نازل ہوئی۔ایسی شکلوں میں اس آیت کا بعینہ منطبق ہونا چنداں ضروری نہیں ہے صرف اصل حکم میں انطباق کافی ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے حضورﷺ کی خدمت میں کوئی سوال پیش کیا یا آنحضرتﷺ کے عہد مبارک میں کوئی واقعہ رونما ہوا اور آپ نے اس کا حکم کسی آیت سے مستنبط فرمایا اور اس کو اس موقع پر تلاوت فرمایا تو ایسی صورتوں میں وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ آیت اس بارہ میں اتری۔ایسی ہی شکلوں میں کبھی وہ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا یہ وحی اتری۔اس سے انکا اشارہ اس بات کی طرف ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے اس آیت سے استنباط فرمایا اور اس وقت چونکہ آپ کے قلب مبارک پر اس آیت کا القاء بھی وحی اور الہام خداوندی کی نوعیت کا ہوتا ہے اس لئے ایسے مواقع پر فانزلت کا استعمال درست ہے اور اگر کوئی شخص اس کو تکرار نزول سے تعبیر کرنا چاہے تو بھی ٹھیک ہے۔محدثین حضرات قرآن کی آیات کے تحت بہت سی باتیں بیان کرجاتے ہیں جو اصلاً اسباب نزول میں داخل نہیں ہوتیں۔اس کی

(۱)الفوزالکبیر:۱۰۷-۱۰۸

مثالیں ہیں: صحابہ کرام کا اپنے باہمی مذاکروں میں کسی آیت سے استنباط و استدلال، نبی ﷺ کا کسی آیت کو اپنے استنباط کیلئے تلاوت فرمانا، کسی ایسی حدیث کا بیان جس کو آیت کے ساتھ اس کے مقصود یا موقع نزول یا بعض اسماء کے ابہام کی توضیح یا کسی قرآنی کلمہ کے صحیح تلفظ کی ادائیگی کے لئے مفید خیال کیا گیا ہو، سورتوں اور آیات کے فضائل کا بیان اور قرآن کے احکام کی بجا آوری میں پیغمبر ﷺ کے عمل کی صحیح تصویر۔ حقیقت میں یہ سب چیزیں اسباب نزول میں شامل نہیں ہیں اور ایک مفسر کے لئے ان کا احاطہ ضروری نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ''نزلت فی کذا'' اور ''فانزل اللہ تعالیٰ قولہ'' یا ''فنزلت وانزلت'' وغیرہ کی اصطلاحات صحابہ وتابعین رضی اللہ عنھم کے نزدیک کیا مفہوم رکھتی تھیں اور شان نزول سے متعلق جو روایات تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں ان کی نوعیت کیا ہے؟ ان کی حیثیت استنباط واستدلال اور تطبیق کی ہے یا نقل و بیان کی؟ سارا اشکال یہیں سے پیدا ہوا تھا کہ لوگوں نے سمجھا کہ سلف جس آیت کی نسبت کہتے ہیں کہ نزلت فی کذا تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ بعینہ وہی واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب ہے لیکن اوپر علامہ زرکشیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جو اقوال نقل ہوئے ہیں ان سے صاف ہو گیا کہ نزلت فی کذا یا فانزل اللہ تعالیٰ قولہ وغیرہ اصطلاحات کا وہ منشا نہیں ہے جو لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ استنباط و استدلال کے قسم کی ایک چیز ہے یعنی اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس آیت سے فلاں بات نکلتی ہے۔ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد تمام شبہات آپ سے آپ رفع ہو جاتے ہیں۔

تفسیر اور شان نزول کی کتابوں میں بعض اوقات ایک آیت کا سبب نزول کوئی ایسا واقعہ بیان ہوتا ہے جس کا زمانہ اور آیت کے نزول کا زمانہ کسی طرح ایک نہیں ہو سکتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سورہ تو مدنی ہوتی ہے اور شان نزول جو بیان کیا جاتا ہے وہ مکی زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح آیت کبھی مکی ہوتی ہے اور شان نزول جو بیان کیا جاتا ہے وہ مدنی زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ بلکہ بعض شان نزول تو ایسے ملتے ہیں جن کے زمانہ وقوع اور ان سے متعلق آیت کے نزول کے زمانوں میں مدتوں کا فرق ہے۔ ایسے مواقع پر اگر

طالب علم کو یہ بات معلوم نہ ہو کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام کے نزدیک شان نزول کا حقیقی مفہوم کیا ہے تو اس کو مطالعہ میں سخت زحمتیں پیش آتی ہیں بلکہ اس کو شک و انکار کی ان حالتوں سے کشمکش کرنی پڑتی ہے جن کا صدر مضمون میں ہم نے حوالہ دیا ہے۔

بایں ہمہ ہم کو اس سے انکار نہیں کہ شان نزول کے معاملہ میں لوگوں نے بہت افراط سے کام لیا ہے۔ شاید ہی کوئی آیت ایسی نکلے جس کے نیچے کوئی قصہ درج نہ ہو اور عموماً یہ قصے بالکل بے بنیاد اور محدثین کے نزدیک ناقابل اعتبار ہیں۔ طالب قرآن کو ان قصوں میں نہیں الجھنا چاہیے۔ ان قصوں کو قرآن کے فہم میں نہ صرف یہ کہ کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ قرآن کے لئے حجاب اکبر ہیں بالخصوص جو طلبہ نظم قرآن کے جویا ہوں (اور فہم قرآن کی اصل راہ یہی ہے) ان کے لئے ان قصوں سے بڑھ کر کوئی روک نہیں ہے۔ حضرت امام رازیؒ کو جو اشکال پیش آیا تھا اور جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے، وہ اسی قسم کے قصوں کا پیدا کردہ تھا۔ اس قسم کے قصوں کے ساتھ کسی طالب قرآن کے لئے حقیقت کا سراغ لگانا ناممکن ہے۔

یہ احساس صرف ہمارا ہی نہیں ہے بلکہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ بھی فرماتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| ''دانستہ شود کہ اکثر اسباب نزول در فہم معانی آیات دخل ندارد اللھم الا شئی قلیل وآنچہ محمد بن اسحٰق کلبی دریں باب افراط کردہ اندوزیرہر آیتے قصہ آوردہ اند نزدیك محدثین اکثر غیر صحیح است و در اسناد آں نظر است آن را شرط تفسیر دانستن خطائے بین است | یہ بات جاننے کی ہے کہ شان نزول کے بڑے حصہ کو آیات قرآن کے سمجھنے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کا کارآمد حصہ بہت تھوڑا ہے۔ اور یہ محمد بن اسحاق کلبی نے جو اس باب میں زیادتی کی ہے اور ہر آیت کے تحت ایک قصہ نقل کر دیا ہے اس کا بڑا حصہ محدثین کے نزدیک غیر صحیح اور اس کی اسناد محل نظر ہے۔ اس کو شرط تفسیر جاننا سخت غلطی ہے اور کتاب الٰہی کے تدبر کو اس پر موقوف رکھنا اپنے آپ |

وبر حفظ آں تدبر کتاب اللہ را موقوف داشتن حظ خود را از کتاب اللہ فوت کردن است۔"(۱)

کو کتاب الٰہی سے محروم کرنا ہے۔

پس قصص وواقعات کے بارہ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ صرف ان قصوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی جائے جن کی طرف آیات قرآن خود اشارہ کررہی ہیں اور جن کا معلوم ہونا آیت کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

شرط مفسر دو چیز است یکے قصصے کہ آیات تعریض بآں می کنند پس فہم ایمائے ایں آیات بغیر معرفت آن قصص میر نمی شود و دیگر قصہ کہ تخصیص عام یا مثل آں از وجوہ صرف از ظاہر می نماید پس فہم مقصد آیات بدوں آں قصص میسر نشود۔(۱)

مفسر کے لئے قصص میں سے دوطرح کے قصوں کو جاننا ضروری ہے۔ایک وہ قصے جن کی طرف آیات قرآن اشارہ کررہی ہوں۔اس طرح کی آیات کے اشارات کو ان قصوں کو جانے بغیر سمجھنا ممکن نہیں ہے۔دوسرے وہ قصے جو کسی عام کو خاص کررہے ہوں یا اس طرح کوئی اور بات جو ظاہر مطلب سے ہٹا کر کسی اور حقیقت کیطرف لے جانے والی ہو بےشبہ اس طرح کی آیتوں کو ان قصوں کی مدد کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔

یہاں ہم مذکورہ بالاقسم کے قصوں کی ،جن کی طرف قرآن کی آیتیں اشارہ کررہی

(۱) الفوز الکبیر : ۱۰۷-۱۰۸

(۲) أیضاً :۱۰۴

ہیں، بعض مثالیں بھی ذکر کیے دیتے ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال سورہ مجادلہ میں ہے فرمایا ہے۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِی تُجَادِلُکَ فِی زَوْجِهَا وَ تَشْتَکِی اِلَی اللّٰهِ وَ اللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَکُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ (۱)

اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو تم سے اپنے شوہر کے بارہ میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ سے شکوہ کر رہی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں جس عورت کے جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ اگر پورا تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتو اس سے اس آیت کے سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

اسی طرح سورہ احزاب کی مندرجہ ذیل آیات میں حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعات کی طرف سرسری اشارات ہیں جن کی وضاحت ان واقعات کے تفصیلی علم سے ہوسکتی ہے۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِی اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِی فِی نَفْسِکَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَی النَّاسَ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰکَهَا لِکَیْلَا یَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِی اَزْوَاجِ اَدْعِیَائِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا. (۲)

اور جب کہ تم اس سے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔ اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو پس زید نے اس سے اپنا رشتہ کاٹ لیا تو ہم نے اس کو تم سے بیاہ دیا کہ مومنوں کے لئے منھ

---

(۱) المجادلة : ۱

(۲) الاحزاب : ۳۷

بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں جب کہ وہ ان سے اپنا تعلق بالکل کاٹ لیں کوئی تنگی باقی نہ رہے۔

اسی طرح سورہ تحریم کی مندرجہ ذیل آیتوں میں بھی بعض واقعات کی طرف اشارہ ہے، جن سے واقف ہونا آیتوں کے سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثاً فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِہٖ وَ اَظْھَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَ اَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَھَا بِہٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَکَ ھٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ. (۱)

اور جب کہ نبی نے اپنی ایک بیوی سے ایک راز کی بات کہی تو جب انہوں نے اس کو خبر کردی اور اللہ نے اس سے پیغمبر کو آگاہ کردیا تو پیغمبر نے کچھ بات جتادی کچھ ٹال دی تو جب پیغمبر نے بیوی کو اس کی خبر کی تو بولیں کہ آپ کو کس نے اس کی خبر دی پیغمبر نے کہا: مجھے خدائے علیم وخبیر نے خبر دی۔

یہ اور اس طرح کی دوسری آیات اس وقت تک پوری سمجھ میں نہیں آسکتیں جب تک ان واقعات کو نہ معلوم کرلیا جائے جن کی طرف یہ اشارہ کررہی ہیں۔ پس اس طرح کے مواقع پر شان نزول کی جستجو بلا شبہ ضروری ہے لیکن ایسے مواقع قرآن مجید میں بہت زیادہ نہیں ہیں صرف چند ہیں اور عموماً صحیح حدیثوں میں ان کی تفصیلات موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ پہلے قرآن مجید کی آیت پر غور کرنا چاہیے۔ اس کے الفاظ خود بخود واقعہ کی تمام جزئیات نگاہوں کے سامنے کردیتے ہیں۔ لیکن اگر واقعہ کا کوئی پہلو مخفی رہ جائے اور آیت کے الفاظ ان کو ڈھونڈ رہے ہوں تو مزید اطمینان کی خاطر صحیح ذرائع سے قصہ معلوم کرنا چاہیے اور اس کا پورا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ قرآن کے اشارات سے ٹھیک مطابق ہو۔ اس سے مختلف یا اس کے مخالف ہرگز نہ ہو۔

(۱) تحریم : ۳

## خلاصہ مباحث:

پچھلے صفحات میں جو مطالب بیان کئے گئے ہیں، اب مختصر لفظوں میں ان کا ضروری خلاصہ لکھ دیتے ہیں تا کہ مدعا نگاہ کے سامنے آجائے۔

۱۔ قرآن مجید کلام کی اس صنف میں داخل ہے جو بعض اعتبارات سے نہایت آسان و سہل ہوتی ہے اور بعض اعتبارات سے نہایت دقیق اور مشکل۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ یہ ایک سپاٹ کتاب ہے، جس کو سمجھنے کے لئے کسی کاوش اور عمیق مطالعہ کی ضرورت نہیں ہے، بالکل غلط ہے۔ قرآن مجید جہاں تک عام تعلیم کا تعلق ہے بالکل واضح ہے یہ پہلی ہی نظر میں حرام وحلال کے تمام حدود متعین کر دیتا ہے اور نیکی و بدی کو پہچاننے کے لئے تمام آثار اور علامتیں نمایاں کر دیتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عمیق فلسفہ اور گہری حکمت بھی ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے سرسری طور سے گزر جانا کافی نہیں ہے، بلکہ اس پر ٹھہر کر تدبر کرنا چاہیے۔

۲۔ قرآن مجید کی نسبت یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ محض احکام وقوانین کا مجموعہ اور حرام وحلال کے معلوم کرنے کا ایک خشک اور سیدھا سادھا ضابطہ ہے۔ قرآن مجید کی ترتیب، خود اس کی تشریحات کے مطابق تین اجزاء سے ہے، آیات اللہ یعنی دلائل و براہین۔ کتاب یعنی قوانین واحکام، حکمت یعنی روح شریعت اور جوہر دین۔ پہلا حصہ دین کی منطق ہے۔ دوسرا حصہ دین کا نظام ہے۔ تیسرا حصہ دین کا فلسفہ ہے۔ اس لئے قرآن مجید فکر وتدبر کی چیز ہے، چنانچہ حضرات صحابہ کرام اس کی ایک ایک سورہ پر آٹھ آٹھ برس تدبر فرماتے تھے۔ حلقے قائم کر کے اس کی مشکلات پر غور فرماتے تھے۔ آنحضرت ﷺ سے اس کی دشواریوں میں مدد چاہتے تھے، عقل کی طمانیت، روح و دل کی پاکی اور دنیا کی معیشت وسیاست کے لئے اس کو بالکل کافی سمجھتے تھے۔ اور یہ جو بعض جلیل القدر صحابہؓ نے

فرمایا ہے کہ کتاب اللہ ہمارے لئے کافی ہے، تو اس کا مطلب یہی تھا کہ ہمارے دین و دنیا اور عقل و روح کو جو کچھ مطلوب ہے، قرآن مجید وہ سب کچھ اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس نے جسم کیلئے تو سب کچھ دیا ہو لیکن روح کیلئے اس کے پاس کوئی تشفی نہ ہو، یا حلال وحرام کا ضابطہ تو اس نے ہمارے سامنے رکھ دیا ہو جو معیشت دنیا میں ہمارے کام آسکے لیکن ہماری عقل کی بے چینیوں اور دماغ کی الجھنوں کو یوں ہی چھوڑ دیا ہو، ان کو سلجھانے کے لئے ہمیں یونانیوں کی خرافات، متکلمین اور فلاسفہ کی موشگافیوں اور محققین عصر کی تحقیقات کا ممنون ہونا پڑے۔

۳۔ قرآج مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے یہ نکلتا ہو کہ وہ ایک سپاٹ کتاب ہے۔ اس کے برعکس اس میں بے شمار آیات اس مضمون کی ہیں کہ اس پر تدبر کرنا چاہیے۔ بغیر تدبر کے اس کی تعلیمات سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ جو لوگ قرآن مجید کو گہری کتاب نہیں سمجھتے اور آیت وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (۱) (اور ہم نے قرآن کو تذکیر کیلئے نہایت موزوں بنایا، تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا) سے اپنے خیال کی صحت پر دلیل لاتے ہیں ان کا استدلال بالکل کمزور بلکہ غلط ہے۔ آیت مذکورہ کا وہ مطلب نہیں ہے جو عموماً سمجھا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے حصول علم اور تعلیم کیلئے بالکل مکمل اور نہایت موزوں بنایا ہے، اس مقصد کے لئے وہ تمام پہلوؤں سے بالکل لیس ہے۔ اس میں کوئی کسر نہیں ہے "یسرنا" کا لفظ صرف اس کے آسان ہونے کو ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ دراصل اس کے کمال، اس کی جامعیت اور اس کے استقصاء و موزونیت کو ظاہر کرتا ہے، اور اسی سے اس کا آسان ہونا بھی نکلتا ہے کیونکہ جو چیز ایک مقصد کے لئے پوری طرح ہموار اور استوار کرلی گئی ہے وہ اس مقصد کے لئے یقیناً سہل اور آسان بھی ہوگی۔

۴۔ جو لوگ قرآن مجید کی تفسیر کے باب میں صرف روایات ہی پر اعتماد کرتے ہیں، یقیناً وہ غلو کرتے ہیں۔ یہ بات محققین کے مذہب اور طریقہ کے بالکل خلاف

(۱) القمر : ۱۷

ہے۔قرآن مجید کی تفسیر میں اصل الاصول خود قرآن کے الفاظ،اس کے شواہد و نظائر اور کلام کے سیاق وسباق اور اس کے نظم کا لحاظ ہے۔ضروری ہے کہ ہر آیت کی تاویل میں ان چیزوں کو مقدم رکھا جائے، کسی حال میں ان سے اغماض نہ کیا جائے۔لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ روایات و احادیث کی رہنمائی کے بغیر تفسیر قرآن کی مشکلات حل نہیں ہوسکتیں۔قرآن مجید جس عہد کا کلام ہے اور جن لوگوں کو اول اول اس نے مخاطب کیا ہے،قدرتی طور پر اس عہد کی بے شمار خصوصیات اور اس قوم کے بے شمار حالات کی طرف وہ اشارے کرتا ہے جن کو پوری طرح بے نقاب کرنے کے لئے ہم ان لوگوں کی اعانت سے مستغنی نہیں ہوسکتے جو اس کے اولین مخاطب تھے۔ان کی مدد سے یہ فائدہ اٹھانا قرآن مجید کے الفاظ کی حکومت کو باطل کرنا نہیں ہے اور نہ ذرہ برابر اس سے اس کی قطعیت میں کوئی فرق آتا ہے کیونکہ ہم روایات و آثار کی رہنمائی سے وہیں فائدہ اٹھاتے ہیں جہاں قرآن کے الفاظ اشارہ کررہے ہوتے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

یہ دعویٰ اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید اپنے سمجھے جانے کیلئے کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔لیکن قرآن کی تفسیر میں روایات و آثار کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانا قرآن کے محتاج ہونے کا ثبوت نہیں ہے۔یہ ہمارے محتاج ہونے کا ثبوت ہے اور ہمارے محتاج ہونے اور قرآن کے محتاج ہونے میں بڑا فرق ہے۔ہم قرآن سمجھنے کے لئے زبان اور نحو سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن مجید اپنے سمجھے جانے کے لئے ان چیزوں کا محتاج ہے۔پس اس سے قرآن مجید کے کمال پر کوئی حرف نہیں آتا۔

۵۔شان نزول سے بھی قرآن مجید کی قطعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔شان نزول کی حیثیت وہ نہیں ہے جو لوگوں نے عام طور پر سمجھ رکھی ہے۔محققین کے نزدیک وہ استنباط کے قسم کی چیز ہے یعنی صحابہؓ جو یہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت فلاں واقعہ پر اتری یا فلاں بارہ میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس آیت کے نزول کا سبب بعینہ وہی واقعہ

ہے، بلکہ اس کا مطلب بالعموم یہ ہوتا ہے کہ وہ آیت فلاں حکم پر مشتمل ہے۔ معاملہ کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اس راہ کے تمام اشکالات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں اور پھر ان سے بھی قرآن کی تفسیر میں وہیں فائدہ اٹھانا چاہیے جہاں قرآن کے الفاظ داعی ہوں اور ان کی مدد سے کوئی گتھی سلجھ رہی ہو اور ایسے مواقع ، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، قرآن مجید میں بہت زیادہ نہیں ہیں۔

باب ۴

# تفسیر کے اصول ☆

آپ نے مجھے اصول تفسیر پر تقریر کرنے کی دعوت دی ہے۔ میں نے اس موضوع پر آپ کے سامنے گفتگو کرنے کا جو نقشہ سوچا ہے وہ یہ ہے کہ میں پہلے اختصار کے ساتھ ان طریقوں کی وضاحت کروں گا جو نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنھم کے مبارک دور کے گزرنے کے بعد ہمارے مختلف مکاتب خیال کے مفسرین نے تفسیر میں اختیار کئے۔ پھر مختصراً ان طریقوں کی خامیوں پر تنقید کروں گا۔ اس کے بعد میں تفسیر کے وہ اصول پیش کروں گا جو میرے نزدیک صحیح اصول ہیں۔ جن کے صحیح ہونیکی ہماری عقل تصدیق کرتی ہے اور جو میرے علم کے مطابق، دور صحابہؓ کے اہل تاویل ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھتے رہے ہیں۔ تقریر کا یہ نقشہ ایک طرف تو آپ کے سامنے وہ سارے طریقے اجمال کے ساتھ پیش کردے گا جو دور صحابہؓ کے بعد سے ہمارے مفسرین اور اہل تاویل نے اختیار کئے ہیں اور دوسری طرف وہ سارا مواد آپ کے سامنے اکٹھا ہو کر آجائے گا جو اہل تفسیر کے مختلف مکاتب خیال کے اصولوں میں موازنہ کرنے اور ان کے حق و باطل میں امتیاز کرنے کے لئے ضروری ہے۔

ہماری تاریخ کے مختلف زمانوں میں تفسیر سے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب پر نگاہ ڈال کر اگر ان کے نقطہ ہائے نظر کے اختلاف کو سامنے رکھتے ہوئے ان کو الگ الگ کیا جائے تو ہمارے سامنے چار بڑے مکتب خیال، اپنے مخصوص اصولوں کے ساتھ نمایاں ہوں گے۔ میں یہاں مختصراً ان چاروں مکاتب خیال اور ان کے طریقہ تفسیر کا آپ کے سامنے تعارف کراؤں گا۔

☆ تقریر جو ۱۵ ار دسمبر ۱۹۵۱ء کو پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔اے (اسلامیات) کے طلبہ کے سامنے کی گئی۔
بعض اجمالات کی وضاحت کے ساتھ

## محدثین اور اہل روایت کا طریقہ:

ہمارے اہل تفسیر میں سب سے زیادہ معتبر گروہ محدثین اور اہل روایت کا ہے۔ اس گروہ کا اصول یہ ہے کہ تفسیر میں اصلی اعتماد نبی ﷺ کے ارشادات، صحابہؓ کے آثار اور اہل تاویل کے اقوال پر کیا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی سب سے بڑی کوشش تفسیر میں یہ رہی ہے کہ ہر آیت کے تحت اہل تاویل کے جس قدر اقوال مل سکیں وہ جمع کر دئے جائیں۔ یہ اقوال بسا اوقات ایک دوسرے کے بالکل مخالف بھی ہوئے ہیں لیکن نہ تو ان میں کوئی تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور نہ ان میں کسی انتخاب کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس اصول پر تفسیر کی جو سب سے بڑی کتاب لکھی گئی ہے اور آج بھی موجود ہے وہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تفسیر جامع البیان ہے۔ اس تفسیر میں تمام تفسیری روایات اور اہل تاویل کے تمام اقوال کا پورا ذخیرہ موجود ہے۔ ہر آیت کے تحت آپ کو متعدد اقوال مل جائیں گے اور آپ یہ امتیاز نہیں کر سکیں گے کہ ان میں سے کون سا قول صحیح ہے اور کون سا غلط؟ روایتی طریق پر تفسیر کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے بیشتر کا ماخذ یہی کتاب ہے۔ جس طرح چراغ سے چراغ جلائے جاتے ہیں اسی طرح اس کتاب کے حذف و اختصار سے بہت سی کتابیں تیار کر لی گئی ہیں۔ ابن کثیرؒ کی مشہور تفسیر بھی اسی تفسیر سے نکلی ہوئی ہے۔

## متکلمین کا طریقہ:

مسلمانوں کا تعلق جب عجمی قوموں سے ہوا اور ان کے علوم اور ان کے فلسفہ سے ان کو سابقہ پڑا تو دینی مسائل پر سوچنے کا وہ انداز فکر وجود میں آیا جس کو ہم علم کلام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس علم کلام نے بھی ہمارے اندر مختلف مکتب خیال پیدا کئے اور ان میں سے ہر مکتب خیال کے لوگوں نے اپنے مخصوص افکار و نظریات کو مسلمانوں میں مقبول بنانے کیلئے قرآن مجید کی تفسیریں لکھیں۔ ان تفسیروں کا مقصد درحقیقت قرآن مجید کی تفسیر لکھنے

سے زیادہ ان افکار و نظریات کے دلائل فراہم کرنا تھا جو ان تفسیروں کے لکھنے والوں نے اپنے متکلمانہ طرز فکر سے پیدا کئے تھے۔اس طرز پر ہمارے ہاں جو تفسیریں لکھی گئیں ان میں سب سے زیادہ مشہور اور اہمیت رکھنے والی تفسیریں دو ہیں۔ایک علامہ زمخشریؒ کی تفسیر کشاف اور دوسری امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کبیر۔ان میں سے مقدم الذکر معتزلہ کے مکتب خیال کے ترجمان ہیں اور موخر الذکر اپنی تفسیر میں ہر جگہ اشاعرہ کے نظریات کی وکالت کرتے ہیں۔روایاتی تفسیروں میں جو اہمیت ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کو حاصل ہے۔ کلامی طرز کی تفسیروں میں وہی اہمیت امام رازیؒ اور زمخشری کی تفسیروں کو حاصل ہے۔بعد میں جن لوگوں نے اس طرز پر تفسیریں لکھی ہیں انہوں نے انہی کی خوشہ چینی کی ہے۔

## مقلدین کا طریقہ:

مقلدین سے میری مراد یہاں ائمہ فقہ یا کتب فقہ کے مقلدین سے نہیں ہے بلکہ مفسرین اور ان کی کتابوں کے مقلدین سے ہے۔ابن جریرؒ،امام رازیؒ اور زمخشریؒ کی تفسیروں کے بعد تفسیر کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ اکثر و بیشتر یا تو انہی سے ماخوذ و مستنبط ہیں یا انہیں کی تلخیص اور انہی کا اختصار ہیں۔ان کے بعد ایسی تفسیریں بہت کم لکھی گئی ہیں جن کی اپنی کوئی مستقل بنیاد ہو۔یہاں تک کہ آہستہ آہستہ تفسیر نگاری کا مقبول عام طریقہ ہی یہی ٹھہر گیا کہ جو کچھ لکھا جائے پچھلی تفسیروں میں سے کسی نہ کسی کی سند پر لکھا جائے۔قرآن کے کسی ترجمہ یا اس کی کسی تفسیر کے مستند ہونے کیلئے یہ بات بالکل کافی سمجھی جانے لگی کہ اس کی ہر بات کی سند پچھلی تفسیروں میں مل جائے۔چنانچہ ہمارے اس دور آخر میں مذہبی طبقہ کی طرف سے قرآن مجید کے جو ترجمے یا تفسیر شائع ہوئی ہیں ان کی سب سے بڑی خصوصیت اگر کوئی بتائی جاسکتی ہے تو وہ غالبا یہی ہے کہ ان ترجموں یا تفسیروں کو ہماری پچھلی تفسیروں کی تصدیق و تائید حاصل ہے۔ان میں سے کسی نے بھی ان حدود سے باہر جانے کی جرأت نہیں کی ہے جو ابن جریرؒ،امام رازیؒ،امام سیوطیؒ،امام شوکانیؒ اور قاضی بیضاویؒ نے قائم

کردئے تھے۔ عام طور پر ترجمہ یا تفسیر میں اس قول پر حرف رکھنے کی گنجائش نہیں سمجھی جاتی جو پچھلی تفسیروں میں سے کسی تفسیر سے ماخوذ ہو۔ ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ اس سہل اور مامون طریقہ کو چھوڑ کر قرآن مجید کی مشکلات کے حل کی راہ میں کوئی قدم آگے بڑھایا گیا ہو

## متجددین کا طریقہ:

متجددین سے مراد وہ لوگ ہیں جو جدید مغربی افکار و نظریات سے متاثر ہیں۔ جس طرح ہمارے متکلمین نے یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر اپنے کچھ مخصوص نظریات پیدا کئے اور ان پر قرآن مجید کو ڈھالنے کی کوشش کی اور اس چیز میں ان کو اتنا غلو ہوا کہ انہوں نے دوسری تمام حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لیں، اسی طرح متجددین کے گروہ نے مغربی افکار و نظریات کو اپنا امام بنالیا اور پھر نہایت بے دردی کے ساتھ قرآن مجید کو ان افکار و نظریات کے پیچھے پیچھے گھسیٹنے کی کوشش کی۔ ہماری قوم میں اس طریقہ تفسیر کی طرح سرسید مرحوم نے ڈالی اور اس کے بعد سے یہ فتنہ برابر بڑھتا ہی گیا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی کتاب کب تک جاہلوں اور اغراض کے بندوں کی تاویل بازیوں کا نشانہ بنی رہے گی۔

## مذکورہ بالا طریقوں پر تنقید:

اب میں مذکورہ بالا تمام طریقوں پر مختصراً تنقید کر کے یہ بتاؤں گا کہ ان طریقوں میں نمایاں خرابیاں کیا کیا ہیں؟

سب سے پہلے اصحاب الروایت کے طریقہ کو لیجئے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ مذکورہ بالا تمام طریقوں میں سب سے زیادہ پاکیزہ اور مامون طریقہ تفسیر کا یہی ہے۔ اس طریقہ کی اصلی خصوصیت تفسیر میں رسول اللہ ﷺ، صحابہ رضی اللہ عنھم اور سلف کے اقوال کا اہتمام ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کرنے کا حق رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ سے زیادہ نہ کسی کو ہو سکتا اور نہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کی تفسیر سے زیادہ کسی کی تفسیر صحیح ہو سکتی ہے لیکن

اس طریقہ میں چند خرابیاں نہایت واضح ہیں جن کا کوئی صاحب علم انکار نہیں کر سکتا۔

۱۔ تفسیر میں آنحضرت ﷺ سے بطریق مرفوع بہت کم منقول ہے۔ اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنھم سے بھی تفسیر کے سلسلہ میں کچھ زیادہ منقول نہیں ہے یہ ہماری تفسیر کی کتابیں زیادہ تر بعد کے اہل تاویل کے اقوال سے معمور ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان اہل تاویل کا یہ مقام نہیں ہو سکتا کہ ان کو تفسیر میں مدارکل قرار دے دیا جائے۔

۲۔ پھر خود ہمارے محدثین کا بیان یہ ہے کہ تفسیری روایات میں وہ احتیاطیں ملحوظ نہیں رکھی گئی ہیں جو احکام وقوانین والی روایات میں ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیری روایات کی بے اصلیت کی تصریح نہایت واضح الفاظ میں فرمائی ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ اس معاملہ میں ان کی تصریح کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ہماری تفسیر کی کتابیں بے اصل روایات سے بھری پڑی ہیں اور ان کے غلط وصحیح میں امتیاز کرنا نہایت مشکل کام ہے۔

اگر ان روایات کی تحقیق وتنقید کر کے ان کے اندر جو مغز ہے اس کو الگ بھی کیا جا سکے جب بھی تنہا انہی کو تفسیر میں فیصلہ کن چیز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہ روایات صحت کے معیار پر پوری اترنے کے بعد بھی ظن کے شائبہ سے پاک نہیں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اگر قرآن مجید کی تفسیر میں تنہا انہی کو فیصلہ کن چیز مان لیا جائے تو قرآن مجید کی قطعیت کو نقصان پہنچے گا اور یہ چیز کسی طرح بھی گوارا نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے دلائل وشواہد کے ساتھ مل کر تو بلاشبہ یہ روایات قرآن مجید کے صحیح مفہوم کی تعیین میں بہت زیادہ مددگار ہو سکتی ہیں لیکن تنہا انہیں کی مدد سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ ہماری تفسیر کی کتابوں میں ایک ایک آیت بلکہ بسا اوقات ایک ایک لفظ کے تحت اہل تاویل کے متعدد اقوال بغیر ان کے دلائل کے ذکر کے نقل کر دئے گئے ہیں۔ یہ اقوال اکثر حالات میں ایک دوسرے سے متناقض ہیں، ظاہر ہے کہ تفسیر کا یہ طریقہ نہایت غلط ہے۔ قرآن مجید اپنی دلالت میں بالکل قطعی ہے اس لئے لازم ہے کہ ان متعدد اقوال

میں سے وہی اختیار کئے جائیں جو قرآن مجید کے سیاق و سباق اور دوسرے قرائن کے مطابق ثابت ہوں، ورنہ قرآن کا قطعی الدلالت ہونا معرض خطر میں پڑ جاتا ہے۔

اب متکلمین کے طریقہ کو لیجئے۔ متکلمین کے طریقہ میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ یہ اپنے نظریات کو اصل قرار دے کر قرآن کو ان کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جہاں کہیں قرآن ان کے نظریات کے سانچہ میں نہیں ڈھلتا ہے وہاں بجائے اس کے کہ وہ اپنے نظریات کی اصلاح کریں اور ان کو قرآن کے مطابق بنائیں، ان کی ساری کوشش اس بات کے لئے ہوتی ہے کہ کسی طرح قرآن مجید کو توڑ مروڑ کر اپنے نظریات کے مطابق بنالیں۔ سلف کے اقوال میں سے یہ لوگ انہی اقوال کو اختیار کرتے ہیں جو ان کے اپنے نظریات کے مطابق ہوتے ہیں۔ جو ان کے پیش نظر منشاء کے مطابق نہیں ہوتے ان کو وہ بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں ہم کو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر میں مل سکتی ہیں۔ وہ بسا اوقات اشاعرہ کے کلامی نظریات کو صحیح ثابت کرنے میں حدود تفسیر سے اس قدر متجاوز ہو جاتے ہیں کہ اگر کوئی آیت ان کو صریحاً مسلک اشاعرہ کے خلاف نظر آتی ہے تو اسکی تردید میں یہ کہنے میں بھی ان کو باک نہیں ہوتا کہ ہمارا جو اصول برہانیات (کلامی دلائل) سے ثابت ہے وہ محض اس بناء پر مجروح نہیں ہو سکتا کہ ایک آیت کے الفاظ، جن کی دلالت تمام تر سماع پر مبنی ہے، اس کے خلاف ہیں۔ اس رجحان تفسیر کے ساتھ قرآن کا کتاب ہدایت ہونا بالکل خارج از بحث ہو جاتا ہے یہاں قرآن مجید رہنما اور امام نہیں رہتا بلکہ اس کو چند کلامی نظریات کے تابع بن کر چلنا پڑتا ہے اور یہ چیز دوسرے الفاظ میں کتاب الٰہی کی نفی ہے۔

کتب تفسیر کے مقلدین کے طریقہ میں وہی خرابی ہے جو ائمہ فقہ یا کتب فقہ کے مقلدین کے طریقہ میں ہے۔ جس طرح ائمہ فقہ بجائے خود سند نہیں ہیں بلکہ سند کتاب و سنت ہیں اور ائمہ فقہ کی صرف وہی باتیں قابل قبول ہو سکتی ہیں جو کتاب و سنت کی کسوٹی پر کھری ثابت ہوں، اسی طرح ہماری تفسیر کی کتابوں میں سے بجائے خود کسی کتاب کو سند

ہونے کی حیثیت حاصل نہیں ہے، ان کی وہی باتیں صحیح ہوسکتی ہیں جو صحت کی عقلی ونقلی کسوٹیوں پر پوری اتریں۔ اس لئے مجرد یہ بات کہ فلاں تاویل امام رازیؒ یا ابن جریرؒ کی تفسیر میں موجود ہے، اس کے صحیح ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس کی صحت یا غلطی کا فیصلہ کرنے کیلئے، ہمیں بالکل دوسرے ہی ذرائع سے کام لینا پڑے گا۔

متجددین کے طریقہ میں بعینہ وہی خرابی موجود ہے جو ہم متکلمین کے طریقہ میں واضح کرچکے ہیں۔ متکلمین نے جس طرح فلسفہ یونان کے زیر اثر اپنے کچھ خاص نظریات تراشے اور پھر ان کو شریعت کی سند دینے کیلئے قرآن کو توڑا مروڑا، اسی طرح جو حضرات مغرب کے جدید افکار ونظریات سے مرعوب ہوئے، انہوں نے اپنے ان نظریات کو مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لئے پوری بے دردی سے قرآن پر ہاتھ صاف کیا۔ مصر کے علامہ طنطاوی اور ہندوستان کے سرسید مرحوم اوران کے نقش قدم پر چلنے والوں نے جو کچھ لکھا ہے اگراس کو پڑھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارے پچھلے متکلمین پھر بھی غنیمت تھے کہ اپنے نظریات کی پچ کے ساتھ ساتھ وہ کچھ پاس قرآن کی زبان، اس کی نحو، اس کے سیاق و سباق یا کم از کم سنت متواترہ کا ملحوظ رکھتے تھے لیکن ہمارے متجدد حضرات نے تو تمام حدیں بالکل توڑ ڈالی ہیں اوراس بے شرمی کے ساتھ توڑ ڈالی ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ ان حضرات کے خیال میں اب دنیا میں پڑھے لکھے لوگ باقی نہیں رہ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرز کی تفسیروں کو تفسیر کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ ان کو قرآن کی تحریف کہنا چاہیے۔

## تفسیر کے صحیح اصول:

اب میں آپ کے سامنے تفسیر کے وہ اصول پیش کروں گا جو میرے نزدیک صحیح ہیں اور جن کے صحیح ہونے کی گواہی عقل بھی دیتی ہے اور جواز روئے نقل بھی صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی وہ اصول ہیں جو ہمارے سلف صالحین قرآن مجید کی تاویل میں پیش نظر رکھتے رہے ہیں۔

یہ اصول دو طرح کے ہیں۔

ایک وہ ہیں جو بالکل قطعی ہیں، ان میں کسی قسم کے ظن یا شبہ کو کوئی دخل نہیں ہے وہ قرآن مجید کی تفسیر کے بلا اختلاف ماخذ ہیں۔ ان کی رہنمائی میں جو تفسیر کی جائے گی اگرچہ ہمارے قصور استعمال اور ہماری علمی کوتاہیوں کی وجہ سے غلطیاں اس میں بھی ہوں گی، لیکن اصول کے حد تک وہ بالکل صحیح تفسیر ہوگی اور اپنے نتائج کے اعتبار سے بھی زیادہ سے زیادہ قریب صحت ہوگی۔

دوسرے وہ اصول ہیں جو ظنی ہیں۔ یعنی قرآن مجید کی تاویل وتفسیر میں وہ مددگار تو ہیں اور ان کی رہنمائی سے توضیح مطالب اور حل مشکلات میں نہایت قیمتی مدد بھی ملتی ہے لیکن چونکہ ان میں ظن اور شبہ کو دخل ہے اس لئے ان سے صرف اسی حد تک رہنمائی حاصل کی جاسکے گی جہاں تک وہ قرآن کی موافقت کریں اور ان سے قرآن کے کسی اشارہ یا تلمیح کی وضاحت ہورہی ہو۔

## تفسیر کے چار قطعی اصول:

تفسیر کے قطعی اصول چار ہیں۔ یہ چاروں اصول جہاں تک ہمارے بیان کرنے کا تعلق ہے الگ الگ بیان ہوں گے لیکن یہ تفسیر قرآن میں استعمال بالکل ایک ساتھ ہوں گے۔ ایک ساتھ استعمال ہونے ہی کی وجہ سے ان کے اندر وہ استحکام پیدا ہوتا ہے جو ان کو قطعیت کا درجہ دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو بلکہ ان کو الگ الگ استعمال کرنے کی کوشش کی جائے تو ان میں سے اکثر اپنی قطعیت کھو بیٹھیں گے۔

ا۔ پہلا اصول یہ ہے کہ تفسیر کا اول ماخذ اس زبان کو بنایا جائے جس زبان میں قرآن مجید اترا ہے۔ میری مراد یہاں اس عام عربی زبان سے نہیں ہے جو عام طور پر لکھی اور بولی جاتی ہے۔ اس زبان کو قرآن مجید کی زبان سے بہت کم تعلق ہے۔ قرآن مجید جس عربی زبان میں اترا ہے وہ آپ کو مصر و شام کے رسائل یا وہاں کے مصنفین ومولفین کی کتابوں

میں نہیں مل سکے گی بلکہ اس کے لئے آپ کو امرءالقیس، لبید، زہیر، عمرو بن کلثوم اور حارث بن حلزہ وغیرہ اور عرب کے خطبائے جاہلیت کے کلام کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اور اس کلام کی آپ کو اس حد تک ممارست بہم پہنچانی پڑے گی کہ آپ اس کے اصلی و نقلی میں امتیاز کر سکیں، اس کے اسالیب و محاورات کو اچھی طرح سمجھ سکیں، اس کے حسن و قبح کو معین کر سکیں، اس کے انداز ایجاز و اطناب کو معلوم کر سکیں، اس کی تلمیحات و اشارات سے محظوظ ہو سکیں، ظاہر ہے کہ یہ کام ہے بہت مشکل، لیکن جو لوگ قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ جب تک اس مشکل کو آسان نہیں بنائیں گے وہ قرآن مجید کے فہم میں تفسیروں اور ترجموں کی خوشہ چینی سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

قرآن مجید کے الفاظ و اسالیب کے معنی متعین کرنے میں یہ ضروری ہے کہ لفظ یا اسلوب کے وہ معنی لئے جائیں جو کلام کے عام استعمالات میں معروف و مشہور ہیں، وہ معنی ہرگز نہ لئے جائیں جو غیر معروف ہیں۔ قرآن مجید معروف و مشہور زبان میں اترا ہے، اس کے الفاظ شاذ معانی میں استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ اس اصل کو جن لوگوں نے پیش نظر نہیں رکھا ہے انہوں نے بسا اوقات الفاظ کے ایسے معانی لے لئے ہیں جو عربی زبان میں معروف نہیں ہیں۔ عام طور پر تو اس طرح کی غلطی کا نتیجہ کچھ زیادہ خطرناک نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ کسی تاویل میں معروف معنی کے بجائے غیر معروف معنی لے لئے جاتے ہیں۔ لیکن اسی طرح الفاظ کے شاذ معنی لے کر گمراہ فرقوں نے جو فتنے اٹھائے ہیں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ معروف معنی کو چھوڑ کر شاذ معنی لینے کا فتنہ دین میں کیسا سخت و شدید ہے اور اس سے کتنی بڑی بڑی آفتیں برپا ہو سکتی ہیں۔

قرآن مجید کی نحو کے متعلق بھی قابل اطمینان طریقہ یہی ہے کہ نحو کی عام کتابوں کے بجائے اس کا ماخذ کلام عرب کو بنایا جائے، ہمارے اہل نحو نے تتبع اور تلاش کی کمی کی وجہ سے قرآن مجید کے بہت سے استعمالات کو شواذ اور مستثنیات میں ذکر کیا ہے۔ حالانکہ قرآن

مجید عرب کے معروف اسلوب پر اترا ہے۔ اس لئے یہ نہیں ہوسکتا کہ معروف اسلوب دوسرے ہوں اور قرآن مجید کا اسلوب غیر معروف ہو۔ میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اس طرح کے کتنے ہی اسالیب کو جو اہل نحو کے نزدیک غیر معروف سمجھے جاتے تھے، اپنی تلاش وتتبع سے معروف ثابت کردیا۔ اس کا فائدہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ قرآن مجید کے اسالیب شواذ ومستثنیات کی ثانوی فہرست میں گنے جانے کے بجائے معروف اسالیب کی صف اول میں آجاتے ہیں، بلکہ اکثر مقامات میں معانی کے تعین اور تاویل کے انتخاب پر بھی اس کا نہایت گہرا اثر پڑتا ہے، اس لئے اس کو محض ایک علمی کاوش سمجھ کر نظر انداز کردینا صحیح نہیں ہے(۱)۔

زبان کے سلسلہ میں آپ کو فن بلاغت سے بھی واسطہ پڑے گا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ ہم مسلمان قرآن کو ایک معجزہ مانتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے اس وصف کو جانچنے کے لئے جو فن سب سے زیادہ کام دے سکتا ہے وہ فن بلاغت ہی ہے، لیکن بدقسمتی سے ہمارا فن بلاغت تمام ترمبنی ہے ان اصولوں پر جو یونانیوں سے لئے گئے ہیں۔ یہ اصول یونانی ادب کی خوبیوں اور بلاغتوں کے پرکھنے کیلئے تو معیار بن سکتے ہیں لیکن ان کو قرآن حکیم کی فصاحت وبلاغت کے جانچنے کیلئے کسوٹی بنانا ایسا ہی ہے جیسے کوئلے تولنے کی ترازو سے اشرفیاں تولنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے اہل فن نے کسی حد تک اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس فن کو عربی زبان کے ادبی تقاضوں اور اس کے خاص رجحانات ومیلانات سے مانوس کریں تا کہ یہ عربی ادب کی خوبیوں کے جانچنے کے بھی کام آسکے۔ لیکن اس سلسلہ میں وہ عربی شاعری کے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں اور اس میں بھی ان کو اسی حد تک کامیابی ہوسکی ہے جس حد تک دو بالکل غیر متناسب چیزوں کے جوڑنے میں کسی شخص کو ہوسکتی ہے۔ بہرحال اس فن کی مدد سے اگر ممکن ہے تو صرف اس قدر ممکن ہے کہ آپ عربی شاعری کے بعض شعری محاسن کو متعین کرسکیں، قرآن

(۱) دیکھیں: امام فراہی کی کتاب 'اسالیب القرآن' درمجموعہ رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن، ص: ۱۰

مجید کے ادبی محاسن کو اس کی مدد سے متعین کرنا ناممکن ہے، بلکہ بہت بڑا اندیشہ اس بات کا ہے کہ اگر آپ اس فن کو رہنما بنا کر قرآن کے محاسن کو متعین کرنے کیلئے نکلیں گے تو عجب نہیں کہ آپ قرآن کو معجزہ ماننا تو درکنار اس کو ایک فصیح و بلیغ کتاب ماننے سے بھی انکار کر بیٹھیں۔ قرآن مجید ایک ایسا کلام ہے جو وحی کے سر چشمہ سے نکلا ہے، جو افصح العرب والعجم کی زبان پر جاری ہوا ہے، جس میں دریا کی روانی اور طوفان کا زور ہے، جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح تمام عرب کی زمین ہلا ڈالی اور جس نے آناً فاناً ایک عالم کے دلوں اور دماغوں کو بدل ڈالا۔ ایک ایسی کتاب کی ادبی خوبیوں کو موجودہ فن بلاغت کے پیمانہ سے ناپنے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے گز لے کر آسمان کی پہنائیوں کو ناپنے کی کوشش کی جائے۔

میں اس موقع پر آپ کو نہایت مسرت کے ساتھ یہ اطلاع دیتا ہوں کہ اس موضوع پر مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب جمہرۃ البلاغۃ چھپ چکی ہے، جس میں مولانا نے قدیم فن بلاغت کی خامیوں پر نہایت تفصیل کے ساتھ تنقید کر کے قرآنی بلاغت کے جانچنے کے لئے اس کا ناکارہ ہونا ثابت کر دیا ہے اور ساتھ ہی وہ اصول بھی متعین کر دئے ہیں جو قرآن حکیم کی فصاحت اور بلاغت کے جانچنے کے لئے معیار کا کام دے سکتے ہیں۔ اب اس سلسلہ میں اگر کوئی کام باقی ہے تو یہ ہے کہ مولانا نے جو اصول قائم کر دئے ہیں، قرآن مجید کے تدبر اور عرب جاہلیت کے خطباء و شعراء کے کلام کے تتبع سے ان اصولوں کے زیادہ سے زیادہ نظائر و شواہد جمع کر دئے جائیں تاکہ اس فن کا مطالعہ کرنے والے آسانی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ ادھر تھوڑے سے عرصہ میں ادب جاہلی کا ایک اچھا خاصا حصہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے جو اس کام میں اہل علم کی بڑی مدد کر سکتا ہے۔

## نظمِ قرآن:

قرآن مجید کو سمجھنے میں دوسری چیز جس کا اہتمام ناگزیر ہے اور جو صحیح تاویل کے تعین میں ایک فیصلہ کن عامل ہے وہ کلام کا نظم ہے۔ نظم کا مطلب یہ ہے کہ ہر سورہ کا ایک خاص عمود یا موضوع ہوتا ہے اور سورہ کی تمام آیتیں نہایت حکیمانہ مناسبت اور ترتیب کے ساتھ اس موضوع سے متعلق ہوتی ہیں۔ سورہ کے بار بار کے مطالعہ سے جب سورہ کا عمود واضح ہو جاتا ہے اور سورہ کی آیات کا تعلق بھی اس عمود کے سامنے آجاتا ہے تو پوری سورہ متفرق آیات کا ایک مجموعہ ہونے کے بجائے ایک نہایت حسین وحدت بن جاتی ہے۔ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے اس نظم کو سمجھنا اولین چیز ہے۔ جب تک یہ نظم سمجھ میں نہ آئے اس وقت تک نہ تو کسی سورہ کی اصلی قدر و قیمت اور اس کی اصلی حکمت ہی واضح ہوتی ہے اور نہ اس سورہ کی متفرق آیات کی صحیح تاویل ہی متعین ہوتی ہے لیکن یہ چیز نہایت مشکل ہے۔ اس وجہ سے ہمارے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے اور جنہوں نے اس کی طرف توجہ بھی کی ہے تو محض سرسری توجہ کی ہے اس وجہ سے وہ اس سلسلہ میں کوئی مفید خدمت نہیں انجام دے سکے ہیں۔ بلکہ جس قسم کا تعلق انہوں نے ایک سورہ کی متفرق آیات میں دکھایا ہے وہ سراسر تکلف معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کا تعلق ہر دو مختلف چیزوں میں جوڑا جا سکتا ہے، خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنی ہی غیر متعلق کیوں نہ ہوں۔ نظم قرآن سے ہماری مراد اس قسم کا تکلفانہ نظم نہیں ہے بلکہ وہ نظم مراد ہے جو کسی بہتر سے بہتر حکیمانہ مضمون میں ہو سکتا ہے اور جس کو مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر 'نظام القرآن' کے اجزاء میں کھولا ہے۔

چونکہ عام طور پر علمائے تفسیر نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے بلکہ بہتوں نے تو قرآن مجید کی بے نظمی ہی کو اس کا ہنر قرار دیا ہے، اس لئے بہت سے لوگ نظم کی تلاش کو ایک غیر ضروری کاوش قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ قرآن مجید میں نظم کو تلاش کرنا کوہ

کندن کاہ برآوردن کا مصداق ہے۔قرآن مجید کی ہر سورہ متفرق نصیحتوں اور متفرق احکام کا مجموعہ ہے اور یہی چیز سامنے رکھ کر اس کی تلاوت کرنی چاہیے، ظاہر ہے کہ اس خیال کے لوگ (اور اسی خیال کے لوگوں کی اکثریت ہے) اس محنت و کاوش کو برداشت نہیں کر سکتے جو نظم کی تلاش کیلئے ضروری ہے، اس وجہ سے سب سے مقدم یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اس بات کا یقین پیدا کیا جائے کہ قرآن کے اندر نظم فی الواقع موجود ہے چنانچہ میں پہلے نظم کے بعض دلائل بیان کروں گا۔

ا۔اس سلسلہ میں سب سے پہلی غلط فہمی جو دور ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں نظم کا دعویٰ کرنے والے اہل علم صرف اسی زمانہ میں ظہور میں نہیں آئے ہیں بلکہ پہلے بھی لوگوں نے اس کا دعویٰ کیا ہے اور بعض نے نظم قرآن پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ چنانچہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ الاتقان فی علوم القرآن میں لکھتے ہیں:

''علامہ ابو جعفر بن زبیر شیخ ابوحیان نے نظم قرآن پر ایک خاص کتاب لکھی اور اس کا نام ''البرھان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن'' رکھا۔اور ہمارے ہمعصروں میں سے شیخ برہان الدین بقاعی کی تفسیر 'نظم الدرر فی تناسب الآی و السور' بھی اسی اصول پر لکھی گئی ہے۔''(۱)

علامہ سیوطیؒ نے خود اپنی ایک کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے نظم قرآن کے علاوہ قرآن کے معجز ہونے کے پہلو بھی واضح کئے (۲) ہیں، اور اسی سلسلہ میں نظم قرآن کی اہمیت کا وہ ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔

''ترتیب اور نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے لیکن اس کے مشکل ہونے کے سبب سے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔امام فخر الدین کو اس چیز کا سب سے زیادہ اہتمام رہا ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ حکمت قرآن کا اصلی خزانہ اس کے

---

(۱) الاتقان: ۹۷۶/۲

(۲) ایضاً : ۹۷۶/۲

نظم وترتیب میں چھپا ہوا ہے۔''(۱)

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں نظم قرآن کی طرف خاص طور پر توجہ کی ہے اگر چہ اس سلسلہ میں ان کی کوششیں کچھ زیادہ مفید نہیں ثابت ہوئیں ۔کیونکہ نظم قرآن کھولنے کیلئے جو محنت درکار تھی اس کیلئے ان کے جیسے مصروف مصنف کے پاس فرصت مفقود تھی۔تاہم اس چیز کی اہمیت وہ جس قدر محسوس کرتے تھے اس کا اظہار انہوں نے جگہ جگہ اپنی تفسیر میں کیا ہے، چنانچہ وہ آیت وَلَوْ جَعَلْنَاہ قُرْآناً أَعْجَمِيًا لَقَالُوا الخ (حم السجدہ) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے جواب میں اتری ہے جو ازراہ شرارت یہ کہتے تھے کہ اگر قرآن مجید کسی عجمی زبان میں اتارا جاتا تو بہتر ہوتا لیکن اس طرح کی باتیں کہنا میرے نزدیک کتاب الٰہی پر سخت ظلم ہے۔اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی آیتوں میں باہم گر کوئی ربط وتعلق نہیں ہے۔حالانکہ یہ کہنا قرآن حکیم پر بہت بڑا اعتراض کرنا ہے۔ایسی صورت میں قرآن کو معجزہ ماننا تو الگ رہا اس کو ایک مرتب کتاب کہنا بھی مشکل ہے۔میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک ایک مربوط کلام ہے۔''(۲)

اس کے بعد تقریباً انیس سطروں میں سورہ کی اجمالی تفسیر لکھ کر فرماتے ہیں:

''ہر مصنف، جو انکار حق کا عادی نہیں ہے تسلیم کرلے گا کہ اگر سورہ کی تفسیر اس طرح کی جائے جس طرح ہم نے کی ہے تو پوری سورہ ایک ہی مضمون کی حامل نظر آئے گی اور اس کی تمام آیتیں ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کریں گی (۳)۔''

اس سلسلہ کی ایک نہایت اہم شخصیت علامہ مخدوم مہائمی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کی

(۱) الاتقان : ۹۷۶/۲

(۲) التفسیر الکبیر : ۱۳۳/۲۷

(۳) أیضاً : ۱۳۴/۲۷

تفسیر "تبصیر الرحمن و تیسیر المنان" تفسیر مہایمی کے نام سے نہایت مشہور ہے۔اس تفسیر میں انہوں نے اپنی کوشش کی حدتک آیات قرآن کا نظم بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ اس میں ان کو کامیابی ہوئی ہے یا نہیں؟ اور اگر ہوئی ہے تو کس حدتک ہوئی ہے؟

اسی مسلک کے ایک بزرگ علامہ ولی الدین برہانی ملوی ہیں ۔قرآن کے نظم سے متعلق ان کا ارشاد یہ ہے۔

"جولوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول چونکہ حالات کے تقاضے کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے ہوا ہے اس وجہ سے اس میں نظم نہیں تلاش کرنا چاہیے، انکو سخت دھوکا ہوا ہے۔قرآن مجید کا نزول بلاشبہ حسب حالات جستہ جستہ ہوا ہے لیکن جس طرح اس کو ترتیب دیا گیا ہے اس میں نہایت گہری حکمت ملحوظ ہے۔"(۱)

مذکورہ بالا اقوال جو مشہور علمائے امت کے ہیں اس بات کی نہایت واضح شہادت ہیں کہ قرآن مجید میں نظم کے قائل صرف مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ یا ان کے تلامذہ ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے پہلے دوسرے علماء نے بھی اس چیز کو محسوس کیا ہے اور اس کی شہادت دی ہے۔

پھر ایک بڑا قابل لحاظ پہلو اس بحث میں یہ ہے کہ جن علماء نے نظم کا انکار کیا ہے انہوں نے بھی اس کی ضرورت اور کلام میں اس کی اہمیت محسوس کی ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو علماء نظم کے قائل نہیں ہیں وہ بھی اکثر کسی تاویل کی تائید وحمایت میں کلام کے سیاق و سباق کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کلام کے سیاق وسباق کو دلیل میں اسی وقت پیش کیا جا سکتا ہے جب اس کو ایک منظم کلام مانا جائے۔مشہور تفسیروں میں سے یہ چیز ابن

(۱) اصل عبارت یوں ہے: "قد وهم من قال: "لا يطلب للآى الكريمة مناسبة لانها على حسب الوقائع المفرقة وفصل الخطاب؛ أننا على حسب الوقائع تنزيلا و على حسب الحكمة ترتيلا و تأجيلا ... (الإتقان ۲/۷۷۹)

جریرؒ کی تفسیر میں بھی موجود ہے اور صاحب کشاف کے یہاں بھی یہ چیز پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں حضرات اکثر جگہ کسی آیت کی مختلف تاویلات میں سے اس تاویل کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کو نظم کلام سے زیادہ مناسبت رکھنے والی نظر آتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر چہ یہ حضرات نظم قرآن کو، اس کے اشکال کی وجہ سے ہر جگہ کھولنے کا التزام نہ کر سکے لیکن جہاں کہیں نظم سے استدلال ممکن ہوا ہے انہوں نے اس کو ایک کلام کی بدیہی خصوصیت مان کر اس کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ امام رازی کا ذکر ہم یہاں اس لئے نظر انداز کرتے ہیں کہ نظم قرآن کے معاملہ میں وہ مذکورہ بالا دونوں بزرگوں سے بالکل مختلف حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ نظم کی ضرورت واہمیت کے، جیسا کہ ان کے ان اقوال سے واضح ہے، جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، نہایت شدت کے ساتھ قائل ہیں اور ہر آیت کے تحت اس کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر چہ، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، ان کو اس کوشش میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

جو لوگ نظم قرآن کا اپنی خواہش کے بالکل برخلاف انکار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں انہوں نے اس انکار کے لئے جو دلیل دی ہے وہ اس قدر کمزور دلیل ہے کہ دوسرے تو درکنار وہ خود بھی اس سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن مجید ضرورت اور حالات کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا کر کے اترا ہے۔ اس وجہ سے اس میں کوئی نظم نہیں ہے۔ یہ دلیل محض اس امر واقعہ سے ٹوٹ جاتی ہے کہ لمبی سورتوں میں سے بعض اور چھوٹی سورتوں میں سے اکثر پوری پوری ایک ہی دفعہ میں نازل ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سورتوں کی بے نظمی کی توجیہ مذکورہ بالا دلیل سے نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اسی بناء پر ان حضرات کے خلاف امام رازیؒ نے وہ اعتراض اٹھایا ہے جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔

ہمارے نزدیک ان حضرات کے انکار کی وجہ کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ محض یہ چیز ہے کہ انہوں نے خیال کیا کہ قرآن میں نظم کا دعویٰ کرنا اور پھر اس کو ہر جگہ کھول نہ سکنا ایک بڑی

کمزوری کی بات ہوگی ،اس سے مخالفین اسلام قرآن پر اعتراض کرنے کی ایک راہ پالیں گے اور یہ بات امت کے حق میں مضر ہوگی۔اس چیز سے بچنے کیلئے انہوں نے یہی مناسب خیال کیا کہ سرے سے نظم ہی کا انکار کردیں۔اگرچہ انہوں نے یہ بات نیک نیتی سے کی لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس کا ضرر اس چیز کے ضرر سے کہیں زیادہ ہے جس سے قرآن کو بچانے کے لئے ان حضرات نے یہ راہ اختیار کی۔اس معاملہ میں صحیح راہ یہ تھی کہ جس حد تک نظم کو واضح کر سکتے اس حد تک واضح کرنے کی کوشش کرتے اور جہاں نہ واضح کر سکتے وہاں اپنے قصور علم کا اعتراف کر لیتے نہ کہ کلام کے ایک صریح عیب کو اس کا ہنر ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔

۳۔جن لوگوں نے قرآن کے جمع وترتیب سے متعلق روایات پر غور کیا ہے وہ اس امر واقعہ سے انکار نہیں کر سکتے کہ قرآن اگرچہ جستہ جستہ نازل ہوا ہے، لیکن آیات کی ترتیب آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق ہوئی ہے جو آیات اترتیں آپ خود سورتوں کے اندر ان کی جگہ متعین فرماتے اور کاتبین وحی کو حکم دیتے کہ ان آیتوں کو فلاں سورہ میں فلاں مقام پر رکھو۔اور کاتبین وحی آپ کی ہدایت کے مطابق ان آیات کو انکی متعین جگہوں میں رکھتے۔ چنانچہ اس بات پر تمام امت کا اتفاق ہے کہ آیت کی ترتیب، آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق ہوئی ہے۔سوال یہ ہے کہ اگر قرآن مجید میں نظم نہیں ہے تو آنحضرت ﷺ اس قسم کا حکم کیوں دیتے ؟ پھر تو بہتر ترتیب نزولی ترتیب ہوتی؟ جس ترتیب سے آیتیں اترتی جاتیں اسی ترتیب سے ان کو رکھواتے چلے جاتے؟ جب نزولی ترتیب چھوڑ کر ایک خاص ترتیب اختیار کی گئی تو اس امر پر غور کرنا پڑے گا کہ آخر اس نئی ترتیب کو اختیار کرنے کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا صحیح جواب ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ترتیب مضامین کی مناسبت کے لحاظ پر قائم ہے۔اوپر علامہ ملوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو قول ہم نقل کر آئے ہیں اس سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

ہمارے اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قرآن مجید کے کسی حکم کے نازل ہونے کے بعد اگر کوئی ایسی آیت اتری جس میں اس حکم کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے کسی تخفیف یا ترمیم کا حکم دیا تو وہ آیت، خواہ سابق اصلی حکم کے کتنے ہی طویل زمانہ کے بعد نازل ہوئی ہو، لیکن بالعموم اس کو اسی سابق حکم کے ہی پہلو میں جگہ دی گئی۔ اس کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور اگر کہیں اس اصول کی خلاف ورزی کی گئی ہے تو نظم کلام اور مناسبت مضمون کی اصولی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

۴۔ قرآن مجید میں الگ الگ سورتوں کا قائم کیا جانا اور ان میں سے کسی کا بڑا اور کسی کا چھوٹا ہونا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید میں نظم ہے۔ اگر قرآن مجید ایک غیر منظم کتاب ہے تو یہ الگ الگ سورتیں قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہر صاحب عقل اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر سورتوں کے مضامین الگ الگ نہ ہوتے اور ہر سورہ ایک مخصوص وحدانیت اور ایک خاص عمود کی حامل نہ ہوتی تو تلاوت اور حفظ قرآن کے نقطہ نظر سے سب سے زیادہ آسان ترتیب یہ ہوتی کہ جامعین قرآن آیتوں کے مجموعے کو لیتے اور ان کو برابر سورتوں میں رکھتے چلے جاتے۔ لیکن جب انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ الگ الگ سورتیں قائم کیں جن میں کوئی بڑی ہے اور کوئی چھوٹی تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ ان سورتوں کے مضامین الگ الگ ہیں۔ اور ان میں سے ہر سورہ ایک خاص وحدانیت اور خصوصیت کی حامل ہے۔

۵۔ سورتوں کی موجودہ ترتیب بھی جو تمام مصاحف میں یکساں طور پر بغیر کسی اختلاف کے پائی جاتی ہے اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ قرآن مجید ایک منظم کتاب ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب میں جو تقدیم و تاخیر پائی جاتی ہے وہ بلا کسی سبب کے نہیں ہوسکتی؟ اس لئے اس سوال پر غور کرنا پڑے گا کہ یہ تقدیم و تاخیر کس اصول پر مبنی ہے؟ ظاہری طور پر سورتوں کے بڑے چھوٹے ہونے کو اس تقدیم و تاخیر میں

سب سے زیادہ دخل ہونا چاہئے تھا، لیکن قرآن مجید پر ایک نگاہ ڈال کر ہر شخص اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اس چیز کا قرآن میں ذرا بھی لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ کیونکہ ترتیب میں سورہ فاتحہ کو سورہ بقرہ سے پہلے جگہ دی گئی ہے حالانکہ دونوں کی مقدار میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ اسی طرح سورہ کوثر جو قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورہ ہے ایسی متعدد سورتوں سے پہلے رکھی گئی ہے جو مقدار میں اس سے بڑی ہیں۔ یہ بھی مسلم ہے کہ یہ ترتیب نزول بھی نہیں ہے کیونکہ اس ترتیب کے اعتبار سے مشہور روایت کے لحاظ سے، قرآن میں سب سے پہلے سورہ اقرأ کو جگہ ملنی چاہیے تھی لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ سورہ اقرأ آخری پارہ میں رکھی گئی ہے۔ یہ صورت حال آدمی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ مقدار اور ترتیب نزولی کے سوا اس تقدیم وتاخیر کا کوئی اور سبب تلاش کرے، ہمارے نزدیک اس تقدیم وتاخیر کی وجہ سورتوں میں باہم دگر معنوی مناسبت کا لحاظ ہے۔ ممکن ہے ہمارے اس دعویٰ پر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ سورتوں کی ترتیب تو صحابہؓ کے زمانہ میں ہوئی ہے، اسلئے اس ترتیب کے اسرار پر غور کرنا ہی ایک فضول کام ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اول تو سورتوں کی ترتیب، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، آنحضرت ﷺ کے حکم سے ہوئی ہے، ثانیاً اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہؓ کی رائے سے ہوئی ہے تو اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ صحابہؓ نے سورتوں کو یوں ہی، بغیر کسی معنوی مناسبت سے جمع کر دیا؟ درآنحالیکہ اس بات سے ہر شخص واقف ہے کہ سورہ برأت کے بارہ میں جب صحابہؓ میں اختلاف ہوا کہ اس کو کس جگہ رکھا جائے تو یہ گتھی بالآخر نظم کی مدد سے سلجھی اور معنوی مناسبت سے اسکو سورہ انفال کے بعد جگہ دی گئی۔

یہ بات ہم نے ان لوگوں کا خیال پیش نظر رکھ کے کہی ہے جو کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب صحابہؓ کے زمانہ میں اورانہی کی رائے سے ہوئی ہے، ورنہ ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ سورتوں کی ترتیب بھی ہدایت الٰہی کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے

دی ہے، ہمارے اس دعویٰ کی تائید قرآن اور احادیث دونوں سے ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ قیامہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ. (۱)

ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کا سنانا تو جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''اس آیت میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ قرآن مجید عہد نبوت ہی میں آنحضرت ﷺ کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر کے سُنا دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ وعدہ اگر آپ کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس جمع و ترتیب کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا''

دوسری یہ کہ اس قرأت ثانیہ کے مطابق، جو جمع کے بعد ہوئی، آپ کو حکم ہوا کہ آپ امت کو قرآن مجید سنائیں اور یہ بات عقلاً و نقلاً ناممکن ہے کہ پیغمبر ﷺ کے پاس کوئی حکم، بغرض تبلیغ آئے اور آپ اس کو امت تک نہ پہنچائیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (۲)

اے رسول! تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچادو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔

(۱) القیامۃ :۱۷۔۱۹

(۲) المائدۃ :٦٧

اس حکم عام کا تقاضا یہ ہے کہ اس قرأت کا اصل کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس جمع و ترتیب کے بعد اگر اللہ تعالیٰ نے کسی حکم عام کو خاص یا کسی حکم خاص کو عام کرنا چاہا یا کسی بات کی تکمیل کرنی چاہی تو یہ ساری باتیں بھی کردیں۔

قرآن مجید ان تمام مراحل سے عہد نبوت ہی میں گزر گیا۔ اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ آنحضرت ﷺ لوگوں کو پوری پوری سورتیں سناتے تھے۔ اور یہ بات بغیر اس کے ناممکن ہے کہ قرآن مجید ایک خاص ترتیب کے ساتھ آپ کو سنایا گیا ہو۔ اسی ترتیب کے مطابق صحابہؓ نے آپ سے قرآن مجید سیکھا۔ روایات میں اس بات کی تصریح ہے کہ آپ آیات کو مناسب جگہوں میں رکھنے کی ہدایت فرماتے تھے اور آپ کے اس حکم کی تعمیل کی جاتی تھی۔ اگر بعد میں کوئی تشریحی آیت اترتی تو وہ مناسب جگہ میں رکھ دی جاتی۔ اس طرح جب پورا قرآن مجید مکمل ہو گیا تو حضرت جبریلؑ نے، جیسا کہ صحیح احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔ آں حضرت صلعم کو آخری مرتبہ پورا قرآن سنایا۔

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد نظام قرآن کی بہت سی مشکلات خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ (۱)

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بالا تحقیق سے جو انہوں نے خود قرآن سے اخذ کی ہے، یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید جس ترتیب کے ساتھ ہمارے زمانہ میں موجود ہے یہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق عہد نبوت ہی میں مکمل ہو چکی تھی لیکن چونکہ اس زمانہ میں عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج کم تھا اور کاغذ وغیرہ بھی نہایت کمیاب تھا۔ اس وجہ سے ایک عرصہ تک قرآن مجید کھجور کے پتوں، ہڈیوں، تختیوں اور حفاظ کے سینوں ہی میں رہا۔ حضرت ابو بکرؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ترتیب نبوی کے مطابق منتشر آیات کو

(۱) تفسیر نظام القرآن: ۲۱۲-۲۱۳

ایک مصحف میں جمع کیا اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں اس نسخہ کی متعدد نقلیں تیار کرا کے ان کو ممالک اسلامیہ کے مختلف حصوں میں بھجوایا۔

۶۔ قرآن مجید کے منظم ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن مجید مسلم طور پر ایک اعلیٰ کلام ہے اور کوئی کلام جو نظم سے خالی ہو وہ اعلیٰ کلام نہیں ہو سکتا۔ کسی کلام کی اصلی روح اس کا نظم ہوتا ہے۔ نظم کو الگ کر دینے کے بعد کلام نہ صرف یہ کہ اپنی بعض ادبی خوبیوں سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ پورا کلام مہمل اور بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے۔ جو کلام نظم سے خالی ہو لوگ اس کو از قبیل خرافات سمجھتے ہیں اور کم از کم کوئی عاقل آدمی تو اس پر وقت صرف کرنا پسند نہیں کرتا۔ قرآن مجید کی نسبت تمام دنیا کو علم ہے کہ اس نے عربوں کو چیلنج کیا کہ وہ اس کے مانند کوئی ایک سورہ پیش کریں لیکن اہل عرب اس تمام فخر و ناز کے باوجود جو ان کو اپنی فصاحت و بلاغت پر تھا، اس کے چیلنج کے جواب میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورہ بھی پیش نہ کر سکے۔ قرآن مجید کی اس ادبی و معنوی عظمت کے لحاظ سے سب سے پہلی چیز جو اس میں ہونی چاہیے وہ نظم ہے۔ کیونکہ ایک ایسی کتاب جو سب سے زیادہ منتشر اور بے نظم خیال کی جاتی ہو وہ فصحائے عرب کو کبھی مرعوب نہیں کر سکتی تھی۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ قرآن کے اس چیلنج میں سب سے بڑی چیز جو فصحائے عرب کے چھکے چھڑا دینے والی تھی درحقیقت اس کا معجزانہ نظم کلام ہی تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں کہیں عربوں کو چیلنج کیا ہے ان سے اپنی مثل (۱) ایک کتاب یا دس سورتیں (۲) یا حدیث من مثلہ (۳) ، یا کم از کم ایک سورہ (۴) پیش کرنے

(۱) الإسراء : ۸۸

(۲) هود : ۱۳

(۳) الطور : ۳۴

(۴) البقرة : ۲۳

کا مطالبہ کیا ہے، اس سے کم کا مطالبہ نہیں کیا ہے کیونکہ اس سے کم میں کلام حسن کا نظم واضح نہیں ہوسکتا جو درحقیقت اس کی اصلی جان ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عرب وعجم کے تمام علمائے بلاغت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کلام کی اصلی روح اس کا نظم ہے اسی سے اس کی تمام خوبیاں ظہور میں آتی ہیں اگر کسی شخص کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل ہو تو وہ کسی بلیغ سے بلیغ خطیب کے کلام کو لے کر اس کے نظم کو درہم برہم کردے، اس کلام کا سارا زور دفعۃً غائب ہو جائے گا۔

نظم قرآن کی یہ چند دلیلیں میں نے محض اس خیال سے پیش کی ہیں کہ آپ حضرات میں سے اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہو کہ قرآن مجید ایک منتشر اور بے نظم کتاب ہے اور اس کی بے نظمی ہی اس کا اصلی وصف ہے تو یہ غلط فہمی رفع ہو جائے اور آپ پورے اعتماد کے ساتھ نظم قرآن کو فہم قرآن میں رہنما بنا سکیں۔

## تلاش نظم کے اصول:

لیکن نظم قرآن کے دلائل بیان کرنے سے زیادہ ضروری تو یہ ہے کہ وہ اصول بتائے جائیں جو تلاش نظم میں رہنما کا کام دے سکیں۔ کوئی شخص نظم کا انکار اس لئے نہیں کرتا کہ اس کو اس کی اہمیت کا اعتراف نہیں ہے یا اس کے وجود کے دلائل اس پر واضح نہیں ہوئے ہیں بلکہ اس کے انکار کی اصلی وجہ یہ ہے کہ نظم کی تلاش اور اس کا تعین ہے بڑا مشکل کام۔ اگر مشکل کسی طرح آسان ہو جائے تو اس کی قدر و قیمت اور فہم کلام میں اس کی کلیدی اہمیت سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

میرے لئے اس مختصر صحبت میں تلاش نظم کے اصول بیان کرنا بڑا مشکل ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ اس طرح کی متعدد صحبتیں بھی اس مقصد کے لئے کافی نہیں ہوسکتی ہیں۔ اس کے لئے صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ پوری تفصیل کے ساتھ آپ کو پہلے وہ اصول بتائے جائیں جو نظم قرآن کی تلاش میں آپ کی رہنمائی کرسکتے ہیں اور پھر ان اصولوں کے استعمال کرنے

کی آپ کو مشق کرائی جائے۔ جہاں تک اصولوں کے معلوم کرنے کا تعلق ہے وہ تو آپ اس دور کے سب سے بڑے خادم قرآن مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کے مطالعہ سے کر سکتے ہیں۔ بالخصوص ان کی کتاب دلائل النظام (۱) سے توقع ہے کہ جہاں تک اصول کے معلوم کرنے کا تعلق ہے اہل علم کے لئے کوئی مشکل باقی نہیں رہ جائے گی لیکن ان اصولوں کو برتنا اوران سے فائدہ اٹھانا آپ کے شوق علم اور ذوق جستجو پر منحصر ہے۔

میں اس صحبت میں جو خدمت کر سکتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ بعض اشارات کر دوں جو تلاش نظم میں آپ کی رہنمائی کر سکیں۔ میرے خیال میں تلاش نظم میں تین چیزوں کی وجہ سے سب سے زیادہ مشکلیں پیش آیا کرتی ہیں، اس لئے انہی کی نسبت میں بعض مفید اشارات یہاں کروں گا۔ اگر آپ نے ان سے فائدہ اٹھایا تو آپ بہت سی مشکلوں کو حل کر لیں گے۔

سب سے پہلی چیز جس کے سبب سے لوگ عموماً نظم قرآن سے مانوس نہیں ہوتے وہ قدیم عربی ادب کی خصوصیات سے ناآشنائی ہے۔ عربی زبان میں اطناب وایجاز اور طول و اختصار کے جو قاعدے ہیں اور جن کو عرب کے فصحاء نہایت آزادی کے ساتھ برتتے ہیں، ہم اپنی زبان میں عام طور پر ان چیزوں سے اچھی طرح مانوس نہیں ہیں۔ اس وجہ سے جب قرآن میں ان سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ ہماری گرفت میں نہیں آتیں۔ اعلیٰ عربی ادب سے جن لوگوں کو سابقہ رہا ہے وہ جانتے ہیں کہ عربی زبان میں کس طرح بات ایک خاص نقطہ سے شروع ہوتی ہے اور پھر بات میں بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک خاص حد پر پہنچ کر کلام پھر اپنے اصلی مرکز کی طرف لوٹ آتا ہے۔ ایک طرف یہ پھیلاؤ ہوتا ہے تو دوسری طرف اسی کے اندر ایجاز واختصار کے گوناگوں پہلو ملحوظ ہوتے ہیں جن سے صرف عربی ادب کے ماہرین ہی آشنا ہوتے ہیں، دوسرے لوگ ان باتوں کو نہیں سمجھ

(۱) یہ رسالہ پہلے علاحدہ ''دلائل النظام'' کے نام سے ۱۳۸۸ھ میں، بعد کو چل کر ۱۹۹۱ء میں ''التکمیل فی اصول التاویل'' کے ساتھ ''رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن'' کے نام سے دائرہ حمیدیہ سے شائع ہوا اور دستیاب ہے۔

سکتے ۔ایک دعویٰ آتا ہے اور معاً اس کے ساتھ اس کی دلیل مذکور ہوتی ہے لیکن یہ واضح نہیں کیا جاتا کہ یہ اس کی دلیل ہے بلکہ یہ چیز محض موقع کلام کی دلالت پر اعتماد کر کے چھوڑ دی جاتی ہے۔ اسی طرح فلاں اعتراض یا فلاں شبہ کا جواب ہے، اس چیز کو بھی سیاق کلام یا مخاطب کی ذہانت کے بھروسہ پر نظر انداز کر دیا جائے گا۔ بسا اوقات ایک خاص سلسلہ کلام کے اندر ایک بات بطور التفات یا بطور جملہ معترضہ کے آجائے گی اور کبھی کبھی وہ اتنی دراز ہو جائے گی کہ اگر مخاطب اچھی طرح متنبہ نہ رہے تو سر رشتہ کلام ہی اس کے ہاتھ سے جاتا رہے۔ ایک داستان بیان ہوگی اور اس کے اندر وہ سارے حصے چھوڑ دیئے جائیں گے جن کو ایک ذہین سامع کو خود بخود جوڑ لینا چاہیئے ۔ بسا اوقات کچھ خاص نتائج کو پیش نظر رکھ کر ایک بات کہہ دی جائے گی اور یہ نہیں واضح کیا جائے گا کہ یہ بات کن خاص نتائج کو پیش نظر رکھ کر یہاں کہی گئی ہے۔

اس طرح کے بے شمار پہلو ہیں جن سے آدمی اس وقت تک اچھی طرح مانوس نہیں ہوتا جب تک قدیم ادب عربی اور خطبائے جاہلیت کے کلام سے اسے اچھی طرح واقفیت نہ ہو اور قرآن چونکہ اعلیٰ ادب عربی کی تمام پاکیزہ خصوصیات کا حامل ہے اس لئے ان چیزوں کی ناواقفیت قرآن کے نظم کے سمجھنے میں مانع ہوتی ہے۔

دوسری چیز جس کے سبب سے نظم قرآن کے سمجھنے میں زحمتیں پیش آئی ہیں، وہ یہ ہے کہ عموماً لوگ اس بات کا تعین نہ کر سکے کہ قرآن مجید کلام کی کونسی صنف ہے؟ یہ اس طرح کی کوئی تصنیف ہے جس طرح کی فنی تصنیفیں ہوا کرتی ہیں، یا یہ شاعروں کے کلام سے مشابہ ہے؟ یا کاہنوں کے کلام سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے؟ یا یہ خطیبوں کے کلام کے طرز پر ہے؟ کفار عرب اس کو شعر (۱) اور کاہنوں (۲) کے سجع سے تشبیہ دیا کرتے تھے اور آج کل کے لوگ

---

(۱) یس : ۶۹، الأنبیاء : ۵

(۲) الحاقة : ۴۲، الطور : ۲۹

اس میں عموماً ایک فنی تصنیف کی خصوصیات ڈھونڈتے ہیں۔حالانکہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے۔قرآن مجید اگر مذکورہ بالا اصناف کلام میں سے کسی کلام سے مشابہت رکھتا ہے تو وہ خطباء کا کلام ہے لیکن اس صنف کلام سے بھی اس کا تعلق صرف مشابہت ہی کے حد تک ہے۔یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ یہ تمام تر خطبات کی خصوصیات کا حامل ہے۔

اس کو خطباء کے کلام سے مشابہ کہنے کا ہمارا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورہ اپنے ماحول سے نہایت گہرا تعلق رکھتی ہے اس وجہ سے اس کو سمجھنے کیلئے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ پہلے اس ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی جائے جس ماحول کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر وہ اتری ہے۔اس ماحول کو سمجھنے کے لئے ہرگز قرآن مجید سے خارج کسی چیز کی مدد کی احتیاج نہیں ہوتی۔یہ ماحول خود قرآن ہی کی روشنی میں منور ہوجاتا ہے لیکن یہ معین کرنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ کیا تقاضے ہیں جو اس کلام کے داعی ہوئے ہیں۔جب یہ تقاضے ٹھیک معین ہوجاتے ہیں تو اس پوری سورہ کا نظام ایسی خوبی اور ایسی وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے اور کلام اپنے ماحول سے اس طرح وابستہ ہوجاتا ہے کہ ہر شخص بے تکلف پکار اٹھتا ہے کہ یہ جامہ اسی قامت کے لئے تراشا گیا تھا۔

جامۂ بود که برقامت او دوخته بود

بعض لوگ ان تقاضوں کو معین کرنے میں شان نزول کی ان روایات سے مدد لیتے ہیں جو تفسیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔یہ طریقہ نہایت غلط ہے۔شان نزول کی روایات نظم قرآن کو درہم برہم کرنے میں سب سے زیادہ دخل رکھتی ہیں اور ان کا بیشتر حصہ بے سروپا باتوں پر مشتمل ہے۔اس لئے صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ آپ خود قرآن کے اشارات سے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کریں جب آپ یہ جان لیں گے کہ کلام کن لوگوں کو خطاب کررہا ہے۔جن لوگوں کو خطاب کررہا ہے ان میں کن کی طرف اس کا خطاب براہ راست اور کن کی طرف بالواسطہ ہے؟ کون سا مرحلہ ہے جس کے حالات سے مخاطب دوچار ہے اور اس

مرحلہ نے کیا کیا سوالات اٹھادیئے ہیں جن کے جوابات کے دوست بھی منتظر ہیں اور دشمن بھی؟ نیز دشمنوں کی مخالفت کیا نوعیت اختیار کرچکی ہے اور دوست کس حال میں ہیں؟ مخالف صفوں میں کون کون سی پارٹیاں کن حربوں سے مسلح ہوکر آ شامل ہوئی ہیں اور موافقین کے مختلف گروہ کس طرز پر سوچ رہے ہیں؟ تو خود بخود کلام کا سارا نظام آپ کے سامنے بے نقاب ہوجائے گا یہ ساری باتیں خود فحوائے کلام کے اندر بول رہی ہوتی ہیں اس لئے اگر محنت کر کے ان کو معین کرلیا جائے تو نظم کلام آپ سے آپ کھلتا چلا جاتا ہے اور قرآن کی ایک سورہ پڑھ کر دل پر وہی اثر طاری ہوتا ہے جو اثر ایک بہترین خطیب کے ایک بہترین مناسب حال خطبہ سن کر دل پر طاری ہوتا ہے۔

اس سلسلہ کی تیسری مشکل تعیین خطاب کی مشکل ہے۔ قرآن مجید پر تدبر کرنے والا جس چیز سے سب سے زیادہ الجھن محسوس کرتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے بلکہ بسا اوقات ایک ہی آیت کے اندر خطاب بدلتا رہتا ہے۔ ابھی خطاب مسلمانوں سے تھا ابھی مشرکین سے ہوگیا۔ ابھی ذکر اہل کتاب کا چل رہا تھا کہ دفعۃً مسلمان مخاطب ہو گئے۔ ابھی خطاب واحد کے صیغہ سے تھا، فوراً ہی جمع کے صیغہ میں ہوگیا۔ اسی طرح خود مصدر خطاب بھی بدلتا رہتا ہے۔ ابھی خطاب براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا کہ دفعۃً رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہوگیا۔ ابھی رسول اللہ ﷺ کی زبان سے کوئی بات کہی جارہی تھی کہ دفعۃً کوئی بات حضرت جبریل امین کی زبان سے تراوش ہوئی۔ مخاطب اور متکلم کی یہ تبدیلیاں ایک نومشق آدمی کو بہت پریشان کرتی ہیں اور اس قدر تیزی کے ساتھ جو تبدیلیاں واقع ہوں ان کے ساتھ سررشتہ نظم سنبھالنا بڑا مشکل ہے۔

تبدیلی خطاب کی بہت کچھ الجھنیں تو اس بات کے سمجھ لینے ہی سے دور ہو جاتی ہیں کہ قرآن مجید بہت بڑی حد تک خطبائے عرب کے کلام سے مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح ایک خطیب محض اپنے رخ کی تبدیلی یا گردش چشم وابرو سے بلکہ بسا اوقات لب ولہجہ کے تغیر

اور معمولی التفات ہی سے اپنے مخاطب اثنائے کلام کے اندر بدلتا رہتا ہے اسی طرح قرآن مجید میں بھی خطاب کی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں اور اگر قاری کلام کے پس منظر پر نظر رکھتا ہو تو اس کو اس انتشار خطاب سے کوئی الجھن نہیں پیش آتی۔ بلکہ وہ کلام کی روانی کے ساتھ ساتھ بے تکلف مخاطب کو معین کرتا چلا جاتا ہے لیکن اس کے بعض پہلو ایسے بھی ہیں جو ہر شخص کی گرفت میں آسانی کے ساتھ نہیں آتے اور جب تک ان کو گرفت میں لینے کی اچھی طرح مشق بہم نہ پہنچالی جائے وہ گرفت میں آ بھی نہیں سکتے۔

میں یہاں استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے مقدمہ تفسیر نظام القرآن سے تعیین خطاب والی فصل کا ضروری خلاصہ نقل کرتا ہوں، جس سے بڑی حد تک اس مشکل کے حل کرنے میں مدد ملے گی۔ مولانا پندرہویں مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

''مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پورا قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یعنی اس کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ پر اتارا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پورے قرآن میں تمام خطاب بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ مثلاً اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِینُ (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی ہی سے مدد مانگتے ہیں) میں ظاہر ہے کہ خطاب بندہ کی طرف سے ہے۔ علماء اس مضمون کو یوں تعبیر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ بندوں کی تعلیم فرمائی ہے کہ یوں کہو لیکن یہاں ''کہو'' کا لفظ موجود نہیں ہے تو اس مقدر کو کس طرح مانا جائے؟ اسی طرح کا سوال مخاطب کے بارہ میں پیدا ہوتا ہے یعنی یہ خطاب کن سے ہے؟ ہر کتاب میں دو پہلو ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ خطاب کس کی طرف سے ہے؟ دوسرا یہ کہ خطاب کس سے ہے؟ اور ان دونوں کا حال یہ ہے کہ کبھی یہ عام ہوتے ہیں لیکن مراد خاص ہوتی ہے اور کبھی خاص ہوتے ہیں اور مراد عام ہوتی ہے اور چونکہ اس تبدیلی اور اس عموم و خصوص کے سبب سے معانی میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان کی تعیین کے لئے ایسے اصول دریافت کئے جائیں جو مشکلات میں رہنمائی کر سکیں۔

خطاب میں ایک مصدر ہوتا ہے اور ایک منتہیٰ ۔ مصدر یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا یا جبریل امینؑ یا رسولؐ یا لوگ ۔ اسی طرح منتہیٰ یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا یا رسولؐ یا لوگ ۔ لوگوں میں مسلمان ہوں گے یا منافقین ، یا اہل کتاب ، یا ذریت اسماعیل یا ان میں سے دو یا تین یا سب ۔ اہل کتاب میں سے یا تو یہود ہوں گے یا نصاریٰ یا دونوں ۔ یہ تو بالکل ظاہری پہلو ہوئے اب اس کے التباس واختلاط کی صورتوں پر غور کیجئے ۔ مصدر میں التباس اللہ تعالیٰ ، رسول اور جبریل کے مابین ہوتا ہے اگر کوئی پورے تنبیہ کے بغیر قرآن پڑھتا چلا جائے تو اس کو امتیاز کرنا مشکل ہوگا کہ کون قائل ہے؟ نبی ﷺ اور حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں ۔ یہ کبھی مرسل کا قول نقل کرتے ہیں اور کبھی وہ بات خود ادا کردیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان پر جاری فرمائی ہے ۔ پھر حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں ۔ یہ کبھی نبی ﷺ کے محض مبلغ کلام الٰہی کی حیثیت سے کلام کرتے ہیں اور کبھی آپ کے معلم کی حیثیت سے ۔

قرآن مجید میں یہ تمام حیثیات ایک دوسرے کے ساتھ ملی جلی ہوئی بغیر کسی تنبیہ کے نمایاں ہوتی ہیں اس وجہ سے ان کو معین کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے ۔ اور سیاق کلام کے سوا کوئی دوسری چیز اس معاملہ میں رہنمائی کرنے والی نہیں ہوتی اور یہ چیز کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ چیز آسمانی کتابوں کی ایک مشترک خصوصیت معلوم ہوتی ہے ۔

قاعدہ کلیہ اس بارہ میں یہ ہے کہ جب کلام براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا تو اس میں جلال وہیبت اور قوت وسطوت کا اظہار ہوگا ۔ اس لئے اس طرح کا کلام صرف خاص خاص مواقع پر ظاہر ہوتا ہے اس بات کو ایک مثال سے سمجھو ۔ سورہ علق شروع جبریلؑ کی زبان سے ہوتی ہے لیکن جب کفار پر غصہ کے اظہار کا موقع آیا ہے تو کلام براہ راست خدا کی طرف سے ہوگیا ہے ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے كَلَّا لَئِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهِ لَنَسۡفَعًاۢ بِالنَّاصِيَةِ (العلق ۹۶ : ۱۵ ) (ہرگز نہیں اگر یہ باز نہ آیا تو ہم اس کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے )

مجید نے خود اپنی تعریف کتابا متشابہا کے الفاظ سے فرمائی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ہر حصہ ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ایک ہی بات کہیں اجمال کے ساتھ آتی ہے کہیں تفصیل کے ساتھ، کہیں صرف دعویٰ کی شکل میں آتی ہے کہیں دلیل کے ساتھ۔ کہیں کسی چیز کے ساتھ آتی ہے کہیں کسی چیز کے ساتھ۔ ایک ہی بات کے اتنے گوناگوں پہلوؤں سے آنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک بات اگر ایک جگہ سمجھ میں نہ آئی تو دوسری یا تیسری جگہ سمجھ میں آجاتی ہے اور اگر ایک جگہ اس کا پہلو واضح ہونے سے رہ گیا تو دوسری جگہ کسی اور سیاق میں وہ ضرور واضح ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے قرآن کی تفسیر کا سب سے معتبر ماخذ خود قرآن شریف ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن کی مشکلات خود قرآن سے حل کرنے کی کوشش کرے تو ایک جگہ اگر کسی چیز کا نظم واضح نہیں ہوتا تو دوسری جگہ اس کا نظم واضح ہو جاتا ہے اور اگر ایک جگہ کسی چیز کی دلیل نہیں ملتی تو دوسری جگہ اس کی دلیل مل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات اس کے اسالیب و محاورات تک کی مشکلات مختلف صورتوں میں بار بار نمایاں ہونے کی وجہ سے واضح ہو جاتی ہیں۔ اور چونکہ قرآن مجید کا ہر حصہ یکساں طور پر قطعی ہے اس وجہ سے اس کے ایک حصہ کی تفسیر اس کے دوسرے حصہ کی مدد سے قطعی کی تفسیر قطعی ذریعہ سے ہے اس وجہ سے اس پر کسی بڑے سے بڑے منکر کو بھی حرف رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

۴۔ تفسیر کا چوتھا قطعی ماخذ سنت متواترہ و مشہورہ ہے۔ جہاں تک قرآن مجید کی اصطلاحات کا تعلق ہے مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، عمرہ، قربانی، مسجد حرام، صفا، مروہ، سعی، طواف وغیرہ ان سب کی تفسیر سنت متواترہ کی روشنی میں کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ قرآن مجید اور شریعت کی اصطلاحات کے معنی بیان کرنے کا حق آنحضرت ﷺ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ بات قطعیت کے ساتھ معلوم ہو کہ آنحضرت ﷺ نے ان اصطلاحات کا یہ مطلب بتایا ہے۔ سو اس چیز کی ضمانت یہ ہے کہ ان ساری

اصطلاحات کا حقیقی مفہوم بالکل عملی شکل میں سنت متواترہ کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے اور سنت متواترہ بالکل انہی قطعی ذرائع سے ثابت ہے جن ذرائع سے خود قرآن مجید ثابت ہے۔امت کے جس تواتر نے قرآن مجید کو ہم تک منتقل کیا ہے۔اسی تواتر نے دین کی تمام اصطلاحات کا عملی مفہوم بھی ہم تک منتقل کیا ہے اس لئے اگر قرآن مجید کا ماننا ہم پر واجب ہے تو ان ساری اصطلاحات کی اس شکل کو ماننا بھی واجب ہے جو سلف سے خلف تک منتقل ہوئی ہے۔ان کی صورت میں اگر کوئی اختلاف ہے تو یہ چیز کوئی اہمیت ہمارے دین میں نہیں رکھتی۔پانچ وقت کی نماز سب جانتے اور مانتے ہیں اور اسی قطعیت کے ساتھ جانتے اور مانتے ہیں جس قطعیت کے ساتھ قرآن مجید کو جانتے اور مانتے ہیں۔رہی یہ بات کہ اس میں آمین بالجہر ہے یا آمین بالسر تو یہ بات اختلافی ہوسکتی ہے اور اس طرح کے اختلافات جزئی کی ہمارے دین میں کوئی اہمیت نہیں ہے جو اخبار آحاد سے نکلتی ہیں ان میں جس شخص کا دل جس پہلو پر مطمئن ہو اس کو اختیار کرے اور ایک دوسرے کی تردید و مخالفت کے درپے نہ ہو لیکن جو باتیں سنت متواترہ سے ثابت و معلوم ہیں ان کی مخالفت کرنا خود قرآن کی مخالفت کرنا ہے اور قرآن کی مخالفت کرنے والے کے لئے ہمارے دین میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

منکرین حدیث کی یہ جسارت کہ وہ صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ اور عمرہ و قربانی کا مفہوم بھی خود اپنے گھر سے بیان کرتے ہیں اور امت کے تواتر نے ان چیزوں کی جو شکل محفوظ رکھی ہے اس میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق ترمیم و تغیر پیدا کرنے کے درپے ہیں صریحا خود قرآن کے انکار کے ہم معنی ہے اس لئے کہ جس تواتر نے ہم تک قرآن کو منتقل کیا ہے اسی تواتر سے ان اصطلاحات کی عملی صورتوں کو بھی ہم تک منتقل کیا ہے اس لئے اگر وہ ان کو نہیں مانتے تو پھر خود قرآن کے ماننے کے لئے بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔اس گروہ کے جہلاء نے قرآنی اصطلاحات کے قطعی اور مسلم مفاہیم کے بدلنے کے سلسلہ میں جو جسارتیں کی ہیں

ان کا اندازہ آپ کو ایک حد تک ان بحثوں سے ہوا ہوگا جو گاہ گاہ قربانی سے متعلق ایک گروہ کی طرف سے اخبارات میں اٹھتی رہتی ہیں۔ اور اب تو ان لوگوں نے دنیا اور آخرت جیسی مشہور اصطلاحات کا مفہوم بھی اپنے اغراض واہوا کے مطابق گھڑ لیا ہے۔ دنیا کے معنی ہیں حاضر اور آخرت کے معنی ہیں مستقبل۔ اور قرآن میں جو حکم ہے یہ اپنی آخرت کی فلاح کیلئے خرچ کرتے رہو تو اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سب اپنی موجودہ ضروریات ہی پر نہ صرف کر ڈالو بلکہ مستقبل کی ضروریات کے لئے کچھ بینک میں بھی محفوظ کرو۔

اس سلسلہ میں مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مقدمہ تفسیر نظام القرآن میں فرماتے ہیں۔

''اسی طرح تمام اصطلاحات شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ اور ان کے ساتھ جو اعمال متعلق ہیں تواتر و توارث کے ساتھ سلف سے لے کر خلف تک سب محفوظ رہے۔ اس میں جو معمولی جزوی اختلافات ہیں وہ بالکل ناقابل لحاظ ہیں۔ شیر کے معنی سب کو معلوم ہے اگرچہ مختلف ممالک کے شیروں کی شکلوں اور صورتوں میں کچھ نہ کچھ اختلافات ہیں۔ اسی طرح جو نماز مطلوب ہے وہی نماز ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں ہر چند کہ اس کی ہیئت میں بعض جزوی اختلافات ہیں جو لوگ اس طرح کی چیزوں میں زیادہ کھوج کرید سے کام لیتے ہیں وہ اس دین قیم کے مزاج سے بالکل ناواقف ہیں جس کی تعلیم قرآن پاک نے دی ہے۔

پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ پیش آئے جن کی پوری حد اور تصویر قرآن میں نہ بیان ہوئی ہو تو صحیح راہ عمل یہ ہے کہ جتنے حصے پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور اخبار آحاد پر نہ جم جاؤ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود شک میں پڑو گے اور دوسرے کے اعمال کو غلط ٹھہراؤ گے اور تمہارے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے۔'' (۱)

(۱) تفسیر نظام القرآن : ۴۱-۴۲

## تفسیر کے ظنی ماخذ:

اب میں چند حرف آپ کے سامنے تفسیر کے ظنی ماخذوں کی بابت عرض کروں گا ظنی سے میری مراد یہ ہے کہ ان کے اوپر ہر حال میں پورا پورا اطمینان نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کے اندر چونکہ ظن اور شبہ کو دخل ہے اس لئے ان کو قرآن کی تفسیر میں وہیں تک دخیل بنایا جا سکتا ہے جہاں تک وہ قرآن سے موافقت کریں۔ اگر کوئی بات ان کی قرآن مجید کے خلاف پڑے تو ایسی صورت میں فیصلہ کن بات قرآن کی ہوگی۔ ان کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔

ا۔ تفسیر کے ظنی ماخذوں میں سب سے اشرف اور سب سے زیادہ پاکیزہ چیز احادیث و آثار صحابہؓ ہیں۔ اگر ان کی صحت کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہوتا تو تفسیر میں ان کو وہی اہمیت حاصل ہو جاتی جو اہمیت سنت متواترہ کی بیان ہوئی ہے لیکن چونکہ ان کی صحت پر پورا پورا اطمینان نہیں کیا جا سکتا اس لئے ان سے تفسیر میں اسی حد تک فائدہ اٹھایا جائے گا، جہاں تک یہ ان قطعی اصولوں کی موافقت کریں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ جو لوگ احادیث و آثار کو اس قدر اہمیت دے دیتے ہیں کہ ان کو خود قرآن پر حاکم بنا دیتے ہیں وہ درحقیقت قرآن کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں اور احادیث کی بھی وہ کوئی نشانی نہیں بڑھاتے۔ اس کے برعکس جو لوگ احادیث کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں وہ اس روشنی ہی سے محروم ہو جاتے ہیں جو قرآن مجید کے بہت سے اجمالات کے کھولنے میں سب سے زیادہ مددگار ہو سکتی ہے۔ اعتدال کی راہ اس معاملہ میں یہ ہے کہ قرآن مجید کے اجمالات جس حد تک صحیح احادیث کی روشنی میں کھلتے ہوں اس حد تک ان صحیح احادیث کی رہنمائی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے اور ان کے بالمقابل ہرگز کسی دوسری چیز کو ترجیح نہ دی جائے۔ اور اگر احادیث صریحاً قرآن مجید کے الفاظ اور اس کے سیاق و نظم کے خلاف پڑ رہی ہو تو ایسے مقامات پر توقف کرنا چاہیے اور اسی صورت میں حدیث کو چھوڑنا چاہیے جب یا تو کسی طرح الفاظ قرآن سے اس کی موافقت ہو ہی نہ سکتی ہو یا حدیث کے ماننے کے سبب سے دین کی کسی

ایسی اصل پر زد پڑ رہی ہو جس کا ماننا ضروری ہو۔ جہاں تک صحیح احادیث کا تعلق ہے بہت کم ہی ایسی نوبت آتی ہے کہ قرآن کے ساتھ ان کی موافقت ہو ہی نہ سکے ایسے مواقع پر بہر حال مقدم قرآن ہے اور کسی طرح بھی اس کے تقدم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن ایسے مواقع بہت زیادہ نہیں ہیں۔

شان نزول کے متعلق جو روایات ہیں ان کی سند کے جانچ پرکھ کے ساتھ ساتھ ان کے بارہ میں یہ اصولی حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ہمارے سلف کسی آیت کی شان نزول سے متعلق جو متعین واقعات نقل کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ بعینہ یہی واقعات اس آیت کے نزول کا سبب ہیں۔ بلکہ اس سے ان کی مراد بالعموم یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت اس طرح کے حالات و واقعات کے لئے اپنے اندر احکام رکھتی ہے اس بات کی تصریح ہمارے بڑے بڑے علمائے تفسیر نے کی ہے اور اس سے شان نزول کے سلسلہ کی اکثر مشکلات کا حل ہو جاتا ہے۔ شان نزول کا زیادہ اہتمام صرف ان مقامات میں کرنا چاہیے جہاں قرآن نے کسی متعین واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہو۔ مثلاً سورہ تحریم یا سورہ احزاب میں قرآن نے بعض واقعات کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کیا ہے۔ اس طرح کے واقعات کی وہ تفصیلات احادیث سے لینی چاہیے جو قرآن کے موافق پڑتی ہوں۔ اور ان باتوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے جن کے تسلیم کرنے سے قرآن مجید ابا کرتا ہو یا ان کے ماننے سے ان لوگوں کی زندگیوں پر حرف آتا ہو جن کی زندگیوں کے بالکل پاکیزہ اور معصوم ہونے کی خود قرآن نے گواہی دی ہو۔

۲۔ اسی طرح قوموں کی ثابت شدہ تاریخ سے بھی ہمیں تفسیر قرآن میں مدد لینی چاہیے۔ قرآن مجید نے متعدد پہلوؤں سے قوموں کی تاریخ کی طرف اشارے کئے ہیں۔ کہیں عرب کی پچھلی قوموں مثلاً عاد، ثمود، مدین اور قوم لوط وغیرہ کی تباہی کا ذکر کیا ہے۔ کہیں اہل عرب کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے مکہ میں آنے، بسنے اور خانہ کعبہ کی

تعمیر کے واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کہیں زمانہ نزول کی بعض معاصر قوموں اور ان کے بعض اہم حالات کی طرف اشارے کردئے ہیں۔ اس طرح سے بے شمار تاریخی چیزیں ہیں جو کسی نہ کسی نوعیت سے قرآن میں زیر بحث آگئی ہیں۔ ان سارے اشارات کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے ان قوموں کی تاریخ اور ان کے حالات سے فی الجملہ واقف ہونا ضروری ہے ورنہ وہ مقاصد اچھی طرح دلنشین نہیں ہوسکتے جن کیلئے قرآن مجید نے یہ واقعات بیان کئے ہیں۔

ان تمام تاریخی معلومات کے لئے اس پہلو سے تو ہم ضرورت مند ہیں کہ ان سے قرآن مجید کے بعض اجمالات کی شرح ہوتی ہے لیکن چونکہ انکا ثابت حصہ بہت کم ہے اس لئے ان کیلئے بھی کسوٹی کا کام ہم قرآن مجید ہی سے لیں گے یعنی ان کی جو باتیں قرآن کے موافق ہوں گی ان کو ہم لے لیں گے اور جو باتیں قرآن کے خلاف پڑیں گی ان کو چھوڑ دیں گے۔

اس پہلو سے غور کیجئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ قرآن مجید نے انسانیت پر جو عظیم احسانات کئے ہیں وہ تو الگ رہے، اس نے علم پر اور تاریخ پر جو احسانات کئے ہیں دنیا اگر انہی کا شکریہ ادا کرنا چاہے تو اس کا صحیح حق ادا نہیں کرسکتی۔ ہمارا فن تاریخ ایک بالکل بے جان سی چیز تھا جس سے انسان کو اگر کوئی چیز حاصل ہوتی تھی تو صرف یہ کہ تاریخ کے کچھ واقعات افسانہ کے طور پر دہرا دیے جائیں اور ان سے وقتی طور پر فخر آبا کے جذبہ کو کچھ تسکین بہم پہنچادی جائے۔ قرآن نے تاریخ ایک بالکل نئے نقطہ نظر سے پیش کی۔ اس نے اس کو قوموں کے عروج وزوال کی ایک عبرت انگیز سرگزشت کی حیثیت سے پیش کیا اور قابل تردید دلائل سے ثابت کردیا کہ قوموں کے عروج وزوال میں اصلی عامل انفرادی واجتماعی اخلاق ہی ہے۔ تاریخ کو یہ نیا جلوہ دے کر قرآن مجید نے ہر قوم کی تاریخ کو، جس کو قصوں اور افسانوں سے زیادہ کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، دنیا کی رہنمائی اور ہدایت کیلئے سب سے زیادہ قیمتی چیز بنادیا۔ خصوصیت کے ساتھ بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل کی تاریخ پر قرآن نے

جو احسانات کیئے ہیں ان کے لئے تو تمام دنیا کو قرآن کا ممنون ہونا چاہیے اس لئے کہ ان قوموں کی تاریخ صرف قوموں ہی کی تاریخ نہ تھی بلکہ درحقیقت یہ دنیا کے جلیل القدر انبیاء کے کارناموں کی تاریخ تھی۔ اور اس تاریخ کا مسخ ہو جانا (جیسا کہ عربوں اور یہودیوں کے ہاتھوں ہوگئی تھی) دنیا کا ایک بہت بڑا حادثہ تھا، اس سے ہدایت کے وہ تمام نشان راہ ناپید ہو گئے تھے جو خدا کے صالح بندوں نے انسانیت کی رہنمائی کے لئے نصب کئے تھے۔ یہ قرآن مجید کا کارنامہ ہے کہ اس نے اس تاریخ کے وہ مٹائے ہوئے نشانات اجاگر کئے اور اس کو از سرنو اس طرح پیش کیا کہ اب قیامت تک کے لئے اس کا ہر نقش بالکل غیر فانی بن گیا۔

۳۔ تفسیر کے ظنی ماخذوں میں تیسری چیز قدیم آسمانی صحیفے ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ ہمارے نبی ﷺ انبیاء کے پاک گروہ کے ایک فرد اور قرآن مجید آسمانی صحیفوں کے زمرہ کی ایک کتاب ہے۔ اس لئے قرآن مجید کی تفسیر و توضیح میں دوسری آسمانی کتابوں سے نہایت قیمتی مدد مل سکتی ہے جہاں تک حصول ہدایت کا تعلق ہے اب قدیم آسمانی صحیفوں کی رہنمائی کے ہم محتاج نہیں رہے۔ ہدایت و رہنمائی کے لئے خدا کی آخری کتاب جو ہر نقص سے پاک ہے، ہمارے لئے کافی ہے جس طرح سورج کے طلوع ہونے کے بعد ستاروں کی رہنمائی کی احتیاج باقی نہیں رہتی اسی طرح قرآن کے نزول کے بعد کسی اور کتاب کی احتیاج باقی نہیں رہی۔ لیکن مختلف پہلو ہیں جو تقاضا کرتے ہیں کہ ہم قدیم آسمانی صحیفوں سے براہ راست واقفیت حاصل کریں۔

اول یہ کہ قرآن مجید کے بہت سے اشارات کی وضاحت کے لئے ہمارے علماء کو اہل کتاب سے روایات لینی پڑی ہیں اور وہ روایات چونکہ تمام تر سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں اس لئے ان کی کوئی علمی قدر و قیمت نہیں ہے۔ نہ وہ اہل کتاب پر حجت ہوسکتی ہیں اور نہ ہم ان پر اپنے کسی دعوئ یا دلیل کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم براہ راست قدیم صحیفوں کا علم حاصل کریں تاکہ ان چیزوں کے بارہ میں ہم جو کچھ کہیں وہ علیٰ وجہ البصیرت کہیں۔

دوم یہ کہ قرآن مجید پچھلے صحفات کی تعلیمات کو مکمل کرتا ہے اور ان میں جو خرابیاں پیدا کردی گئی ہیں انکی اصلاح کرتا ہے اس لئے جب آدمی قرآن مجید کے ساتھ قدیم صحیفوں کو پڑھتا ہے تو اس پر قرآن مجید کی عظمت و برتری واضح ہوتی ہے اور اس امت پر اللہ تعالیٰ نے جو فضل عظیم اس کتاب کے ذریعہ سے فرمایا ہے اس کے گونا گوں پہلو بے نقاب ہوتے ہیں۔

سوم یہ کہ قرآن مجید نے بیان احکام کے سلسلہ میں بھی اور تاریخی واقعات کے ذکر کے ذیل میں جگہ جگہ ایسی تلمیحات رکھ دی ہیں جو اس وقت تک پوری طرح واضح نہیں ہوسکتی ہیں جب تک آدمی قدیم صحیفوں سے واقف نہ ہو۔ ہمارے مفسرین میں سے بیشتر حضرات توریت وانجیل سے براہ راست واقف نہ تھے اس وجہ سے اس طرح کی تلمیحات کو وہ اچھی طرح کھول نہ سکے۔

چہارم یہ کہ قرآن مجید نے یہود و نصاریٰ کو اس باتِ کا مجرم گردانا ہے کہ انہوں نے خدا کی کتاب میں تحریفیں کی ہیں۔ ان کے اندر بہت سی ایسی چیزیں شامل کردی ہیں جو ان میں نہیں تھیں اور کتنی چیزیں نکال دی ہیں جو ان میں نہایت تصریح کے ساتھ بیان ہوئی تھیں۔ نیز انہوں نے بیشمار معاملات میں اپنی روش صریحاً اللہ اور اس کے نبیوں کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف بنالی ہے کتنے حرام حلال ٹھہرالئے ہیں اور کتنے حلال حرام کردئے ہیں۔ اس طرح کی ساری باتوں کو مدلل کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ آدمی کی نظر توریت و انجیل پر ہو ورنہ اہل کتاب پر کما حقہ حجت پوری نہیں ہوسکتی۔

پنجم یہ کہ ان تمام خرابیوں کے باوجود جو قدیم صحیفوں میں واقع ہوگئی ہیں ان کے اندر اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے کلام کا ایک حصہ موجود ہے جس کو وہ شخص آسانی کے ساتھ پہچان لے سکتا ہے جو قرآن مجید سے واقف ہو۔ اللہ اور اس کے نبیوں کے کلام کا یہ حصہ درحقیقت مومن کا ایک گمشدہ خزانہ ہے اور مومن اس بات کا حق دار ہے کہ وہ جہاں بھی اس خزانہ کو پائے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

# مراجع ومصادر

## عربی

☆الاتقان فی علوم القرآن للحافظ جلال الدین عبد الرحمن السیوطی. تقدیم و تعلیق: الدکتور مصطفی دیب البغا - دار إبن کثیر- دمشق - بیروت - ط ۱ ۱۴۰۷ - ۱۹۸۷م

☆ التفسیر الکبیر للإمام الفخر الرازی - دار إحیاء التراث العربی - بیروت ط ۱.

☆الفتوحات المکیۃ- دار الکتب العربیۃ الکبری بمصر.

☆الفوز الکبیر فی أصول التفسیر ترجمۃ: محمد سلیم عبد اللہ - اردو اکیڈمی - سندہ کراچی ط ۱ ۱۹۶۰م.

☆الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الأقاویل فی وجوہ التاویل لأبی القاسم جار اللہ محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی - دار المعرفۃ- بیروت لبنان.

☆المعجم المفہرس لألفاظ الحدیث النبوی لأ. ی. وتسفک وی. پ. منسنج مطبع بریل لندن ۱۹۴۲م.

☆المعجم المفہرس لألفاظ القرآن الکریم لمحمد فؤاد عبد الباقی - دار الحدیث - القاہرۃ ط ۱ ۱۴۰۷ - ۱۹۸۷م.

☆ تفسیر القرآن الکریم للحافظ عماد الدین أبی الفداء اسماعیل بن

كثير القرشي الد مشقي - دار الفكر ط ا بيروت.

☆جامع البيان عن تاويل أى القرأن لأبى جعفر بن جرير الطبرى - شركة مكتبة ومصطفى البابى الحلبى وأولاده بمصر ط٣ ١٣٨٨ - ١٩٦٨م

☆ حواشى الإمام الفراهى على القرآن الكريم (مخطوط).

☆ديوان مجنون ليلى - شرحه: الدكتور يوسف فرحات - دار الكتاب العربى بيروت ط ا ١٩٩٢م.

☆رسائل الإمام الفراهى فى علوم القرآن للامام عبد الحميد الفراهى - الدائرة الحميدية ، مدرسة الإصلاح ، سرائے مير اعظم گڑه - ط ا ١٤١١-١٩٩١م

☆شرح القصائد العشر للعلامة التبريزى - دار الكتب العلمية - بيروت - لبنان ط ا ١٤٠٥-١٩٨١م.

☆شرح ديوان الحماسة للعلامة التبريزى - دار القلم - بيروت - لبنان.

☆صفوة التفاسير لمحمد على الصابونى - دار القرآن الكريم - بيروت ط ٤ ١٤٠٢ - ١٩٨١م.

☆فى ظلال القرآن لسيد قطب - دار الشرق - القاهرة ط ١٤ ١٤٠٨ - ١٩٨٧م

☆مجمع الزوائد ومنبع الفوائد للهيثمى - دار الفكر

☆مفردات القرآن للشيخ عبد الحميد الفراهى - مطبعة الاصلاح: سرائے مير اعظم كره - الهند ١٣٥٨

☆مقدمة فى أصول التفسير للعلامة إبن تيمية ط٣ الطبعة السلفية - القاهرة ١٣٩٧هـ

## اردو

☆ تفسیر نظام القرآن، علامہ حمید الدین فراہی ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحی، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ ۱۴۱۱/۱۹۹۰ء۔

☆ تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی، تاج کمپنی، دہلی ۱۹۸۹ء

☆ حقیقت شرک وتوحید، مولانا امین احسن اصلاحی، فاران فاؤنڈیشن، لاہور ۱۹۸۹ء

☆ دعوت دین اور اس کا طریق کار، مولانا امین احسن اصلاحی، فاران فاؤنڈیشن، لاہور ۱۹۸۹ء

☆ قرآنی مقالات، ادارہ علوم القرآن، سر سید نگر، علی گڑھ

## رسائل

☆ الاصلاح دائرۃ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

☆ علوم القرآن ادارۃ علوم القرآن سر سید نگر علی گڑھ

# اشاریہ

## شخصیات

# اقوام وملل

# کتابیں

## مقامات

## احادیث



## مدارس ویونیورسٹیاں



## رسائل وجرائد



## اشعار

### (عربی)

(اردو)



(فارسی)





## اہم آراء